

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیلف میں رکھی کتاب

امجد جاوید

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیلف میں رکھی کتاب

امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز

40- الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون 042-7352332-7232336

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (امجد جاوید) اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

دھب ہستی بنے مقل تو لہو روتے ہیں دل
دل لہو روتیں تو ہوتی ہے کہانی پیدا

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	قیمت میں رگی کتاب
مصنف	امجد جاوید
ناشر	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہد فواید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	قمر ارشاد
سن اشاعت	2012ء
قیمت	300 روپے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

انتساب!

زندگی میں درپیش کچھ
تجربات کے نام

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کچھ کرنا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری مدد کرنا چاہیں تو ہم kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔ یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

۱۔	خال	۰۷
۲۔	وجہ و خاص	۲۳
۳۔	دھواں میں تحلیل چہرہ	۳۲
۴۔	جانور	۴۲
۵۔	صلیب وقت	۵۰
۶۔	بابا گپی؟	۶۳
۷۔	شیلف میں رکھی کتاب	۷۸
۸۔	ماں جیسی	۱۰۱
۹۔	ہار	۱۳۰

خال

"سرتقی! آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ بندہ اسے دیکھ کر آکھ جھپکنا بھول جائے اس قدر چرب زبان اور شاطر ہے، کوئی کتنا بھی پارسا کیوں نہ ہو، بس اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ جائے۔ وہ تو اسے بھی شیشے میں آتار لے گی۔ وہاں میرے جیسے بندے کی کیا اوقات ہے بھلا۔" میرے سامنے میز کے پار بیٹھا وہ نوجوان وقاص اپنی چٹانے کا آغاز کر چکا تھا۔ اس کی بات پوری توجہ اور انتہاک کے ساتھ سننے لگا کیونکہ اس کے لہجے میں وہ درد اور ازلتاک کیفیت کا احساس تھا جو کسی بھی ناکام عاشق کا ہوتا ہے۔

آپ شاید یہ سمجھیں کہ میں کوئی ”لوگر“ قسم کو بندہ ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں ایک ایک ناکام صحافی ہوں۔ جو بڑا نہیں، اچھا صحافی بننے کا خواہش مند تھا۔ میں صحافی سرگرمیوں میں ناکام ہو گیا۔ مگر جنہوں نے مجھ سے قلم پکڑنا سیکھا تھا وہ نہ صرف بڑے بلکہ کامیاب صحافی بن گئے تھے۔ مجھے یہ افسوس بہر حال رہا کہ وہ اچھے صحافی نہ بن سکے۔ کیونکہ ان کے کام ہی کچھ ایسے تھے۔ میں تو ایسے دشمن تلاش کرتا رہا جو مجھے میرے منافق دوستوں سے بچالیتا۔ میں اس میں بھی ناکام رہا۔ خیر۔ ”سلیم شیخ انمی“ کامیاب صحافیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے سامنے ایک نیرحادثہ آن پڑا۔ وہ اس نوجوان وقاص کا مسئلہ تھا۔ اس کے بارے میں مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ایک حسین و جمیل مشاطہ و طرح دار لڑکی نے پیار و محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے لوٹ لیا ہے۔ وہ لڑکی اپنے تعلقات میں اس قدر طاقت ور ہے اب اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ خوف زدہ ہے۔ وہ ان مقامی صحافیوں کے پاس مدد کے لئے آن پہنچا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں سو مجھے بڑے اہتمام سے آفس میں لایا گیا اور اس کو میرے سامنے بٹھا دیا کہ اس کی روداد سنیں اور کوئی حل نکالیں۔ جبکہ میرے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ اس لڑکی سے اتنا خوف زدہ کیوں ہیں؟ یہ سوال ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے وقاص کے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے سوال کیا۔

”تم اگر اس لڑکی کا برا نہیں چاہتے، اس کے ساتھ قلمس ہو تو پھر کیا چاہتے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں، سوائے اس دولت کے جو لڑکی نے مجھ سے ہتھیالی ہے۔ میں قوت گیا ہوں۔ برباد ہو گیا ہوں۔ میرے پلے تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میں تو اب کوئی کاروبار کرنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ چار سال تک کویت میں رہ کر جو پونجی کمائی تھی وہ لے آؤں۔“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”تم اتنے ہی بے وقوف تھے کہ اس پر اپنی ساری پونجی لٹا دی۔ پاگل تھے کیا تم؟“ میں نے کافی حد تک درشت لہجے میں پوچھا۔ میرے بوس پوچھنے پر پھینٹا اس کی نگاہوں میں اس لڑکی کا سراپا لہرایا ہوگا۔ وہ خیالوں ہی میں ٹھنک گیا پھر لمحہ بعد تیزی سے بولا۔

”سر جی، عرض کیا ہے تا، وہ حسین ہی اس قدر ہے کہ بندہ اس کے سامنے جاتا ہے تا تو سمجھو پاگل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ کیا۔۔۔ وہ

تو۔۔۔ دو۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”تو وہ کیا؟“ میں نے چمکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو بالکل دلی ہے، جیسے میرے خوابوں کی شہزادی ہے۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کے حسن ہی کا ہو کے رہ گیا۔ میری ہا قاعدہ منگنی ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ میں سرجی آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔“ اس نے صوفی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر اپنی ٹاہیں جمادیں۔ ”وہ جب میں کویت سے آیا تو میں نے پہلی بار اسے اپنی کزن کی شادی میں دیکھا۔ سرجی وہ کیا شے لگ رہی تھی۔ یادو نچا لہا سرو کے جیسا اس کا قد، گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اس نے، جس پر سنہری کام تھا۔ لباس ایسا تھا کہ جس سے اس کا گورا بدن چمک ہی رہا تھا۔ جسم کا ایک ایک خم نمایاں تھا۔ میں تو دور ہی سے دیکھ کر چمک گیا۔ اتنے خوبصورت بدن والی لڑکی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے کھلے ہوئے گیسو سر سے بھی نیچے تک جمول رہے تھے۔ میں کویت میں رنگ رنگ کا حسن دیکھ کر آیا ہوں۔ مگر جو بات اس میں ہے، نا، کسی اور میں نہیں ہے۔ اسے یوں دیکھ کر شدت سے اُس کا چہرہ دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پھٹنے لگی تھی اور پھر سرجی، میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے جا پہنچا، تب تو پھر میرے دیے ہی ہوش گم ہو گئے۔ کیا نین گش تھے اس کے، میں تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جی کہتے ہیں نا کہ پہلی نظر میں محبت ہو جاتی ہے۔ بس مجھے وہ ہو گئی۔ میرے تو دن رات کا جین لٹ گیا۔ میں نے چند دن بعد ہی اپنے والدین سے کہہ دیا کہ مجھے تو بس یہی رخسانہ ہی چاہیے۔“ اتنا کہہ کر اس نے اپنی بات میں وقفہ دیا۔ جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”اچھا تو اس کا نام رخسانہ ہے، کون ہے وہ؟“ میں نے اس کی ساری سراپا نگاری کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ فوراً گویا ہوا۔

”وہ جی، یہ جو جن مگر ہے۔ وہاں کا جو بنیادی مرکز صحت ہے۔ وہ اس میں ایل ایچ وی ہے۔“

”بس ایک ایل ایچ وی سے ڈرے ہوئے ہو، ارے وہ تو ایک درخواست کی مار ہے۔“ میں نے شیخ سلیم کی طرف دیکھ کر افسوس سے کہا۔ پھر سامنے پڑے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ایک فون کرتا ہوں ضلعی آفیسر کو، اور وہ۔۔۔“ میں نے کہا چاہا تو وہ نوجوان تیزی سے بولا۔

”خدا کے لیے۔ ایسے سو رکھیں اور میری پوری بات سنیں۔“ اس کے یوں کہنے پر میں نے ریسیور رکھ دیا اور پھر سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ ”اس کے تعلقات پہنچیں کہاں کہاں تک ہیں سرجی۔ میرا خیال ہے آپ اب خبروں پر نگاہیں رکھتے۔ شیخ صاحب آپ ہی بتائیں۔“

”وہ پچھلے دنوں وہیں چن چن میں اس نے ایک ڈاکٹر کو تھپڑ مار دیا اور پھر اس ڈاکٹر کے خلاف اس نے جלוں بھی کھلوا دیا۔ اس ڈاکٹر کی تو وہ درست بنی کہ اسے وہاں سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ کافی عرصہ معطل رہنے کے بعد اب بحال ہوا ہے۔ وہ چن چن میں یہ ضلع ہی چھوڑ گیا ہے۔“

”یار ایسی بلا شے کون ہے؟“ میں حیران رہ گیا۔

”وہ ایسی ہی ہے سرجی، وہ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ بس حسن کا ایک شاہکار مجسمہ ہے۔ اس کے پیچھے بہت سارے بے فیرت قسم کے دلال

نما لوگ ہیں۔ کچھ سامنے ہیں اور کچھ اپنی سازشوں میں اس لڑکی کا استعمال کرتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔ کسی بچے اور گھٹیا بندے کو میری کویت سے لائی ہوئی دولت نہیں بھائی۔ مجھے جو غلامی میں عزت اور شہرت ملی ہے وہ انہیں برداشت ہی نہیں ہوئی۔ ایسے حسد کے مارے لوگ مختلف ہتھکنڈوں، جیلوں اور بہانوں سے سازش کر کے اپنے دل کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایسا ہوتا نہیں، ان کی یہ آگ بجھ جاتی ہے۔" اس نے حدود و جہاں ہوتے ہوئے کہا

"ہاں یار مجھ تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔" میں نے ہمدردی سے کہا مگر سلیم شیخ سے پوچھا "کیوں، تمہیں کیا لگتا ہے، وہ کوئی گینگ و غیرہ تو نہیں ہے؟"

"اسے ہی تو سمجھنا ہے کہ ایسا ہے بھی یا نہیں۔ مگر ایسا ہے تو۔۔۔" اس نے معنی خیز لگا ہوں سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا مگر دیر سے مسکرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تب میں نے وہ صدمہ سے پوچھا "اچھا، یہ بتاؤ، مقفی کیسے ہو گئی تمہاری؟"

"بس میری قلعی کا آغاز تو نہیں سے ہوا ہے تا سرجی، میں نے اپنے والدین سے بات کی۔ وہ بہت مشکل سے مانے، کیونکہ ان کی ذات برادری الگ ہے اور ہماری الگ۔ میں نے ہر طرح کا دباؤ دے کر اپنے والدین کو متا لیا۔ انہوں نے درمیان میں کچھ لوگ ڈالے، ان کی مرضی معلوم کی اور پھر ان کے ہاں جا پہنچے۔ دو چار دفعہ آنے جانے سے اور ایک ہی مقصد ہونے کی وجہ سے وہ لوگ مان گئے۔ بس اس طرح مقفی ہو گئی۔ پھر وہ جو اجنبیت کی جھجک تھی، وہ ختم ہو گئی۔ ہم گاہے بگاہے ملتے رہے۔ انہی ملاقاتوں میں وہ پہلے پہل تو دور دور رہتی رہی۔ لیکن پھر ملاقات میں وہ ایک الگ سا نشہ دیتی رہی۔ وہ مجھ پر اس طرح غماز طاری کر دیتی کہ مجھے اپنا ہوش ہی نہ رہتا۔" وہ اپنی زبوں کہتا چلا گیا۔

"مطلب تم شادی سے پہلے ہی۔۔۔؟" میں نے چونک کر پوچھا "نہیں نہیں سرجی، اس کے حسن کا سحر، اس کے لمس شمار، اس کی باتوں کا جاوہ، آئندہ آنے والے دنوں کے خواب کچھ ایسے رنگین ہوتے تھے کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مطالبات بڑھتے چلے گئے۔" اس نے اپنی بات میں زور دیتے ہوئے کہا "کیا مطالبات تھے اس کے؟" میں نے پوچھا

"یہی کہ اگر شادی جلدی کرنی ہے تو پہلے میرے جیڑ کا سامان بنا دو۔ ہر شے میں اپنی مرضی کی خود خریدوں گی۔ میں اسے رقم دیتا رہا۔ میں اب سوچتا ہوں، وہ شاطر ایسی تھی کہ کہیں بھی رقم لینے دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔" وہ تیزی سے بولا "خیر، قصہ کو تا یہ ہے کہ وہ شاطر تعلقات والی طاقت ور حیدرہ تمہیں لوٹ چکی ہے اور اب تم اس سے اپنی رقم واپس لینا چاہتے ہو، بس یہی بات ہے نا؟" میں نے بات کو سینے سے جوڑ لیا۔

"سرجی، اگر تو وہ رقم واپس کر دیتی ہے اور تعلق نہیں رکھنا چاہتی، تو بھی ٹھیک ہے۔ اگر وہ شادی کر لینے پر راضی ہو جاتی ہے تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ اس طرح کم از کم علاقے میں میری عزت ہی رہ جائے گی۔" آخر کار اس نے اپنا نام عیاں کر دیا۔

”اور اگر وہ ان باتوں پر بھی راضی نہیں ہوتی تو پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا

”تو پھر کم از کم اس کا یہاں سے جادو کہیں دور ہو جائے۔“ اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرنا چاہئے؟ میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ میری سوچ جدھر بھی جاتی، وہیں سے ناکام لوٹ آتی۔ میں کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا کہ یہ معاملہ بخیر و خوبی حل ہو جائے۔ تب اچانک میرے ذہن میں خیال آ گیا تو میں نے کہا۔

”یار کیوں نامیں اس سے سیدھے سماؤ جا کر طول اور اس سے ہات کر لوں؟“

”دیکھ لیں، جو آپ بہتر سمجھیں۔“ وقاص نے تیزی سے کہا تو نجانے مجھے یہ شک کیوں گزرا کہ ممکن ہے یہ ہمارے ہی خلاف کوئی سازش تو نہیں ہے۔

”ہم وہاں جائیں گے کیسے؟“ سلیم اپنے مطلب کی بات پراثر آیا۔

”باہر کار کھڑی ہے۔ میں آپ کو لے جاتا ہوں۔ پر میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ آپ اگر اس پر ہاتھ ڈالو تو بہت مضبوطی سے سناپ پکڑنے کے لئے بڑھنا پڑتا ہے۔“ وہ غلط لہجے میں بولا

”میں تمہارا مشورہ ذہن میں رکھوں گا۔ سلیم یا ریم تیار کرو۔“ میں نے کہا اور چمن مگر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ٹیم تیار کرنے کا مطلب تھا کہ اخبار والوں نے اچانک اس بنیادی مرکزِ محنت پر چھاپہ مارا ہے۔ جہاں رعب و اب پڑتا، وہاں سلیم کی دھاڑی کھری ہونے والی تھی۔ مگر مجھے اس کوئی سروکار نہیں تھا۔

چھ بندے چمن مگر کی جانب چل پڑے۔ اندازے کے مطابق وہ کوئی آدمے مجھے کا سفر تھا۔ اس دوران وقاص مجھے اس لڑکی کے بارے میں بہت ساری باتیں سنا تا چلا گیا۔ جو اسے گا ہے بگا ہے معلوم ہوتی رہیں۔ جس ڈاکٹر کے خلاف اس نے جلوس نکھلایا تھا۔ اس سے پہلے ایک ڈاکٹر کے ساتھ مشق کی ششکیں بڑھاتی رہیں۔ جب اسے اچھی طرح ٹیچر لیا تو بلیک میل کرنے لگی۔ وہ بندہ خدا اس سے بچ کچھ کا مشق کرنے لگ گیا تھا۔ وہ ذلیل و خوار ہو کر یہاں سے نکلا، وہ ایسا یہاں سے ایسا گیا کہ اس نے نہ صرف نوکری چھوڑ دی، بلکہ وہ نشے کی لت میں بھی مبتلا ہو گیا۔ رخسانہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنی حفاظت کے لیے چند غنڈے بھی رکھ چھوڑے ہیں، جو عموماً اس کے پاس ہی رہتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی اور کئی باتیں مجھے وقاص نے سنائیں۔ جیسے ہی ہم چمن مگر کے باہر پہنچے تو لو جو ان نے گاڑی روک دی۔ تب میں نے پوچھا

”کیا ہوا گاڑی کیوں روک دی؟“

”آپ جائیں، میں یہیں رکوں گا۔ ظاہر ہے میں ساتھ ہوا تو وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے بھیجا ہے۔ اسے تو ہنک بھی نہیں ملتی چاہیے۔“ وقاص نے کہا تو مجھے اس کی بات نہایت معقول لگی۔ تب میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو؟“

"میں نہیں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ وہ منبر کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل تھا۔ جس کے باہر چار پائیاں اور لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ میں نے اس منظر میں زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ ایک دوسرے لڑکے نے سٹیرنگ سنبھال کر گاڑی بڑھا دی تھی۔ جب میں چمن نگر کے نہادی مرکز صحت کے اندر گاڑی میں سے اترتا تو میرے ذہن میں رخسانہ کا تصور ایک عیاش، شاطر اور خود غرض لڑکی کے طور پر بن چکا تھا، جو اپنی خواہش کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ایسی عورت کو میں سبق سکھانا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اسے سبق سکھانے میں میری خواہش بھی شامل ہوگئی تھی۔ مجھے ان بے غیرت اور گھٹیا مردوں پر زیادہ غصہ آ رہا تھا کہ جو ایسی عورتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

میں گاڑی سے نکل کر سپیدھاڈ اکثر کے کمرے میں چلا گیا اور باقی ٹیم ارد گرد پھیل گئی۔ تاکہ وہ یہ کاروائی ڈال سکیں کہ کتنے ملازمین حاضر ہیں۔ کیا ہوا ہے، اور کہاں کہاں خالی ہے۔ جسے وہ ان کی کمزوری بتا سکیں۔ ایک شریف سا، خشک ڈاڑھی والا، لمبے قد کا ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی مریض نہیں تھا، میز پر مختلف چیزیں تھیں، وہ مجھے اندر آتا ہوا دیکھ چکا تھا، میں نے دینگ انداز میں سلام کیا اور بڑے کمزور سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جی فرمائیں۔" وہ انتہائی تمیز سے بولا تو میں نے اپنا تعارف بڑے شغف سے لیکن دھانسو انداز میں کروایا۔ تب وہ چونک گیا اور کسی حد تک حواس باختہ ہو کر پریشان بھی ہو گیا۔ ظاہر ہے بیٹھے بٹھائے اخبار والے ان پر غصہ کی طرح نازل ہو گئے تھے۔ پھر ایسا چھوٹا اسٹیشن جو پہلے ہی خبروں کی زد میں تھا۔ میں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں، بلکہ اسے لے کر دفتر سے باہر آ گیا اور اپنے انداز میں سوال پر سوال کرنے لگا۔ میرا مقصد رخسانہ کے کمرے تک پہنچنا تھا اور کسی بہانے وہاں ڈک کے اس سے گفتگو کرتا تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے دفتر میں تھا اور وہ میرے سامنے تھی۔ میں چونکا نہیں۔ بلکہ مجھے چوکنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ حجاب میں تھی اور بڑی ساری چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔

"یہ ہیں جی، مس رخسانہ، یہاں ایل ایچ وی ہیں۔ بہت سی سختی اور تجربہ کار اور پابند وقت ہیں۔ ملاقاتی کے محام ان کے کام سے بہت خوش ہیں۔" ڈاکٹر نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کا تعارف کرایا تو میں دھڑکے سے مسکرایا دیا۔ پھر رخسانہ کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ کر کچھ دیر آپ سے باتیں کر سکتا ہوں؟"

"جی کیوں نہیں تشریف رکھیں؟" اس نے کہا، یقیناً اسے میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ سچی ڈاکٹر والہاں مڑتے ہوئے بولا۔

"سچی، آپ یہاں سے فارغ ہو جائیں تو دفتر میں تشریف لے آئیے گا، چائے ادھر ہی پیئیں گے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رخسانہ کی طرف دیکھنے لگا جو سنی سادہ سی بنی سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ بلاشبہ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ گورے رنگ میں گلابی پن کی تھلک تھی، گلابی آمیزش والے گورے رنگ پر سیاہ آنکھیں تو خوبصورت تھیں ہی، لیکن ان میں سن موتی آنکھوں کا دیکھنے انداز اپنی جگہ پر کشش اور منفرد تھا۔ تجسس بھری سوال کرتی، کچھ سہی بے ہاک لگاتی ہیں۔ اس نے اپنا نقاب جس ہاتھ سے روکا ہوا تھا۔ وہ مرمریں ہاتھ شفاف تھا، لالہ لالہ لالہ لالہ لالہ کے ساتھ گول گلابی لکائی، صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میز کی دوسری جانب بیٹھی وہ میری لب کشائی کی منتظر تھی۔ میں نے پاس کھڑی دائی کی طرف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دیکھا، جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ وہاں سے چلی جائے میں اس کی غیر موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری نظروں کا مقبوضہ سمجھ کر وہ بولی۔

”آپ بلا بھجک بات کریں، جو بھی آپ کہنا چاہتے ہیں؟“

”دیکھیں، میں تمہید میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آج اگر ہم اس بنیادی مرکزِ صحت میں آئے ہیں اس کی وجہ صرف آپ ہیں۔“

”میں۔۔۔ وہ کیوں؟“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں چونکتے ہوئے کہا۔ تو میں بڑے پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

”آپ کے بارے میں کافی ساری شکایات ہمیں ملی ہیں۔ جس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ آپ یہاں کی کرنا دھرتا ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی

ڈاکٹر بھی آپ کی مرضی کے خلاف یہاں نہیں نک سکتا۔“

”آپ سے کسی نے مذاق کیا ہوگا“ اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پر اعتماد لہجے میں کہا۔ یقیناً یہ کہتے ہوئے وہ طنزیہ انداز

میں مسکرائی بھی ہوگی کیونکہ اس کی آنکھیں یہی بتا رہی تھیں۔

”آپ کے خیال میں میرے ساتھ کوئی مذاق کیوں کرے گا؟ اور۔۔۔۔۔“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے اسی

اعتماد سے بولی۔

”کیونکہ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے فقط سنا ہوگا اور پھر یہ سوال آپ بغیر کسی تحقیق کے مجھ سے کر رہے

ہیں۔ اگر آپ یہاں تحقیق کر لیتے، جو بہر حال آپ کا فرض بنتا تھا۔ تو آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ایک سرکاری

ملازم ہوں اور یہاں اپنی ڈیوٹی پوری دیانتداری سے دے رہی ہوں۔ ہاں اگر میرے بارے میں کسی کو کوئی شکایت ہے تو بتائیں۔“

”کوئی اگر بتاتا بھی ہے تو آپ کے خلاف کوئی ٹھکانہ کاروائی نہیں ہوتی، جس کی وجہ آپ کے تعلقات ہیں۔ جیسے کہ پچھلے دنوں ایک

ڈاکٹر۔۔۔“

”سرا! اگر آپ کے پاس میری کوئی شکایت نہیں ہے تو پلیز وقت ضائع نہ کریں۔ رہی اس ڈاکٹر کی بات، وہ مسما نہیں۔ بھلیا تھا اور اس کے

ساتھ جو بھی سلوک ہوا۔ وہ بہت تمہوڑا تھا۔ اور جہاں تک تعلقات کی بات ہے تو کاش میں اتنی طاقت ور ہوتی۔ پھر بتاتی۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی

، پھر چیزی سے بولی۔ ”یا پھر اگر کوئی کسی قسم کی انتقامی کاروائی آپ لوگ کرنا چاہتے ہیں تو وہ ایک الگ بات ہے۔“ اس کے لہجے سے جذبات ٹپک رہی تھی۔

”یہ آپ کو ایسا کیوں لگا کہ میں آپ کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی کرنے جا رہا ہوں۔“ میں نے اس کی اکتائی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا

”اس لیے سر، کہ میں نے اب تک یہاں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دیانتداری سے خدمت کی ہے۔ میرا نہیں خیال

کہ کوئی مریض یہاں آیا ہو اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر گیا ہو۔ آپ کا لہجہ اور انداز بتا رہا ہے کہ بات وہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں۔“ اس نے تیز اور ٹھیکے

لہجے میں بے انتہائی سے کہا تو میں سمجھ گیا، اس نے کتنی خوبصورتی سے چہرہ استعمال کیا ہے اس نے صاف انداز میں اپنے آپ کو دیانتدار اور خدمت

گزارنا کر ایک طرف کر لیا اور یہی باور کرایا کہ اس پر کسی اور ہی وجہ سے الزام تراشی کی جا رہی ہے اور یہ اس کے خلاف انتقامی کاروائی ہے۔ یہ وہ

لحات تھے جب مجھے صاف بات کہنے کے لیے تمہید باندھنا پڑی۔

”دیکھ لی بی۔! جب کسی پر کرپشن ثابت کرنی ہو تو اس کے ہزار راستے ہیں۔ لیکن اگر ضلعی آفیسر آپ کا چاولہ کسی دور دراز علاقے میں کر دے تو یہ بعد کی بات ہے کہ آپ اپنے تعلقات آزمائیں گی، کیا خیال ہے؟

”یہی ایک مہری کمزوری ہے جس کے باعث مجھے بلیک میل کیا جاتا ہے لیکن جس قدر مجھے زچ کیا جاتا ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر میرا تادلہ ہوا تو میں نوکری چھوڑ دوں گی۔“

”اس لیے کہ آپ نے بہت زیادہ مال دولت جمع کر لی ہے۔۔۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ٹک کر بولی۔

”سر۔! میں جب آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کھل کر بات کریں تو آپ کیوں جھجک رہے ہیں۔ پولیس کس نے بھیجا ہے آپ کو؟“ اس کا انداز چار حان تھا۔ اس نے کچھ اس طرح طنزیہ انداز میں کہا کہ مجھے ایک لمحہ کو تنگی محسوس ہوئی۔

”یہی کہ پہلے ڈاکٹر، اور پھر دو بھئی پلٹ کواٹھنے کے بعد۔۔۔“ میں نے کہا تا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گئی، آپ کو کس نے بھیجا ہے آپ تو وہ سارے الزامات مجھے بتائیں گے ہی۔ لیکن اس سے پہلے میں وہ سارے الزامات آپ کو بتا دیتی ہوں جو وہ لوگوں کے سامنے مجھ پر لگا تا پھر تا ہے۔ سنیں، میں آپ کو سناتی ہوں۔ لیکن میں پہلے آپ کو بتاتی ہوں کہ میرا تادلہ میری کمزوری کیوں ہے؟“ وہ پھرتے ہوئے بولی۔ اس دوران اسے ہوش ہی نہ رہا کہ اس کا نقاب گر گیا ہے اور اس نقاب میں چھپا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح طلوع ہو گیا۔ شفاف سفید اور گلابی چہرہ۔ ستوان ناک، ریلے بھرے بھرے پتلے لب، گوشت بھری ٹھوڈی اور رخسار تو یوں تھے، جیسے دو قاشیں چہرے پر سی دی گئی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی اس کے حسن سے مبہوت رہ گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں اس کے ہنر کی داد دینے بغیر نہ رہ سکا کہ اس نے نقاب اتارنے کا لمحہ کیا خوب چتا ہے۔ وہ مجھے بھی اپنے رعب حسن میں لپٹ لینا چاہتی تھی۔ جیسے کوئی کمزری اپنے جال میں پھانسنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ میری توجہ ہٹ گئی تھی جس میں وہ بلاشبہ کامیاب ہو گئی تھی۔ مجھے اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔

”سرخ، میرے دلوں والدین بوڑھے ہو چکے ہیں۔ دلوں تیار ہیں، بہت مشقت کر لی انہوں نے۔ میں ان کی دیکھ بھال کے لئے یہاں سے قطعاً کہیں نہیں جاسکتی۔ میرا چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے۔ میرا تادلہ اگر ہو جاتا ہے تو اسے گھر والیں آنا پڑے گا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو کر رہ جائے گی، وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں ہے۔ میں اپنے گھر اور بھائی کے تنظیمی اخراجات خود برداشت کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں ہی اپنے گھر کی واحد کفیل ہوں۔ نہ میں نوکری ختم کر سکتی ہوں اور نہ تادلہ ہو جانا برداشت کر سکتی ہوں۔ اور میری یہی کمزوری ان کے ہاتھ آگئی ہے۔“

”میں نے تمہارے حالات سن لئے لیکن وہ جو الزامات لگا رہا ہے اس میں کوئی تو سچائی ہوگی۔ ابویں تو کسی پر کوئی الزام نہیں لگا دیتا“ میں نے تیزی سے کہا

”نہیں، بہت سارے بے غیرت اور سازشی لوگ ایسے ہیں جو خواہ مخواہ الزام لگا دیتے ہیں۔ جو سراسر ان کی اپنی ذاتی وجہ ہوتی ہے

اور۔۔۔۔۔“

”کیا یہ سچ نہیں کہ آپ کی اس سے منگنی ہوگئی تھی اور منگنی کی آڑ میں تم نے اس کی دولت ہتھیالی۔“

”جھوٹ نہیں، منگنی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے فقط اپنے والدین کو میرے گھر بھیجا تھا۔ میرے گھر والوں نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا، جاتے ہوئے روایت کے مطابق اس کی والدہ میرے ہاتھ میں پانچ سوکانوٹ تھما گئی۔ وہی پانچ لوٹ انکار کے ساتھ انہیں واپس بھجوا دیا گیا۔ وہ جو بندہ واپس دے کر آیا تھا، وہ آج بھی موجود ہے۔ یہی دولت تھی جسے آپ جو مرضی ریگ دے دیں۔ ان کی ذات الگ تھی اور ہماری الگ، بات آگے بڑھتی نہیں سکتی تھی۔“

”اس کا دعویٰ ہے کہ تم نے اس کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارا ہے“

”سریہ الزام نہیں، تہمت ہے۔ میری اس سے یونہی ایک بار سہیں ملاقات ہوئی ہے۔ وہ کسی مرینہ کے ساتھ آیا تھا۔“ وہ رو بانسا ہوتے ہوئے بولی۔ مجھے لگا کہ بہت اچھی اداکارہ بھی ہے۔

”اس مطلب ہے، آپ ہر الزام سے خود کو بری الزامہ قرار دے رہی ہیں۔ ویسے اس ڈاکٹر کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا۔“ میرے یوں کہنے پر اس نے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اہتمام سے بولی۔

”دیکھیں۔! میں نہیں جانتی کہ میں کس قدر حسین ہوں۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت خود کی ہے۔ میں اپنی غربت کے ساتھ ٹڑی ہوں اور لڑ رہی ہوں میں نے اسی جگہ، جن میں لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا ہے لیکن کسی کی جرات نہیں تھی کہ میری طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔ وہ ڈاکٹر شادی شدہ ہو کر مجھ سے عشق فرمانے لگا تھا۔ میں نے اسے احساس دلایا کہ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ لیکن وہ نہیں سمجھا، پھر میں نے اسے سمجھا دیا۔ کیا اپنے کردار کی حفاظت کرنا اب جرم ہے آپ کے معاشرے میں۔ اگر یہ جرم ہے تو میں نے یہ جرم کیا ہے۔ میرے پاس کچھ اور ہونہ ہو ایک صاف اور خفاف کردار ہے اور وہ دو یعنی پلٹ، اپنی دولت کا زعم دکھاتا ہے مجھے۔ اس نے مجھے دھکی دی ہے کہ میرا تبادلہ کروادے گا۔۔۔ کیونکہ اسے میری کمزوری کا پتہ ہے۔“ وہ مدد دہ جذباتی ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا وہ تیزی سے بولی۔ ”اچھا ہوا آپ یہ بات کہنے یہاں تک آ گئے ہیں۔ ورنہ مجھے کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑتا۔ میں آپ سے فقط اتنا کہتی ہوں آپ پوری ایمان داری سے ان الزامات کی تحقیق کریں۔ اگر میں غلط ثابت ہوئی تو جو آپ کا جو حکم ہو گا میں اسے مانوں گی۔ جو سزا دینا چاہیں، میں بھگتوں گی، لیکن اگر یہ سچ ثابت نہ ہوا تو پھر آپ کو میری ماننا ہوگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ ظلم نہیں کریں گے۔“

اس کی بات سن کر میرے پاس کسی بھی قسم کے کسی سوال کی محبت نہیں رہی تھی۔ کوئی سوال کرتا بھی تو وہ محض کی ہنسی ہوتی یا پھر اپنی ہلکت کا واضح اعتراف ہوتا۔ میں چند لمحوں پر چہرہ ہاتھ اٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں پھر آؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گی۔ اور آپ جو حکم دیں گے، میں مان لوں گی۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا۔ میں نے اس کی طرف بھرپور نگاہ سے دیکھا، اس کے چہرے پر حزن پھیلا ہوا تھا، وہ ہیکٹا ہوا چہرہ عجیب کشش لیے ہوئے تھا۔ حسن ہوا اور وہ بھی حزیہ کیلٹ میں تو وہ خواہ خواہ میں الوہی لگتا

ہے۔ میں خود پر جبر کرتا ہوں اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

بنیادی مرکز صحت سے باہر نکلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ایک بار ہوا جھاری ہوں۔ جو میز پر ایک لڑکی کے سامنے اپنے سارے پتے ہار گیا ہے۔ اب صرف جھوٹ اور سچ کا تاراکرنا تھا۔ ظاہر ہے گیند اب میرے کورٹ میں تھی، مجھے پوری تحقیق کرنا تھی۔ لیکن یہ سب ہوتا کیسے؟ میں اس فکر میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میں رخسار کا چہرہ بھی نہیں پڑھ سکا۔ وقتی طور پر اس نے مجھے مطمئن کر کے واپس بھیج دیا تھا جیسے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں کھلونا تھا کہ وقتی طور پر بہلا دیا جائے۔ مجھے اپنی ہزیمت کا احساس ہوا تو خود پر غصہ آنے لگا۔ میں اسی کیفیت میں جب گاڑی میں بیٹھا تو سلیم نے جلدی سے پوچھا۔

”کیا بنا قابو میں آئی یا پھر آپ بھی وہیں دل ہار آئیں ہیں۔“ اس کے یوں فضول رہنماؤں سے کہنے پر جب میں نے گھور کر دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے چہرے پر جو بارہ بجے ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔“

”نہیں یار۔! میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا

”مطلب۔! آپ پر بھی اس کا جاوہل چل گیا۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا

”کونسا نہیں کرو، مجھے کچھ سوچنے دو۔ ابھی راستے میں وہ بھی انتظار کر رہا ہوگا۔“ میں نے کہا تو گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

وہیل کے پاس سڑک کنارے ہمارے ہی انتظار میں کھڑا تھا۔ میں گاڑی سے نکلا تو وہ مجھے لے کر ان چار پائوں کی جانب بڑھ گیا جو نہر کنارے شیشم کے گھنے درختوں کے نیچے دھری ہوئی تھیں۔ جب تک دوسرے گاڑی پارک کر کے آئے، کھانا بھی منجھ دیا گیا۔ میں بہت الجھا ہوا تھا۔ سامنے رزق پا کر بھی بھوک نہیں جا گئی تھی۔ اک شکست کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا اور سچائی کو سامنے لانے کی فکر مجھے ستائے جا رہی تھی۔

”کیسا رہا۔؟“ اس نے پوچھا تو اسی لمحے میرے دماغ میں ایک بات اتر آئی۔ وہ ایک ایسا کتہ تھا، لمحوں میں ساری وضاحت ہو سکتی تھی۔ میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا اور بڑے مزے سے کہا۔

”یار۔! اس کا حسن تو دیکھنے والا ہے۔ یقین جانو، جس طرح تم نے بتایا تھا، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

”کیا بتاؤں جناب۔! یہاں اس کا حسن ہی تو ہے، جس نے میری دن رات کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔“ وہ غلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا

”تمہارا ہی حوصلہ ہے یار، جو تم اس کے ساتھ اتنا وقت گزار لیتے تھے۔ میں تو کچھ دیر ہی میں سمجھو ڈھیر ہو گیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اور حراہ لیتے ہوئے انتہائی سوتیانہ انداز میں کہا۔ ”یاروہ کیا شعر ہے، غلط ہے کہ درست، اب میں سمجھا ہوں تیرے رخسار پہ گل کا مقصد، دولت حسن پر دروہان بٹھا رکھا ہے۔ یاروہ جو اس کے اوپری ہونٹ پر دائیں جانب سیاہ گل ہے، سرخ ہونٹوں پر سیاہ گل، اس نے تو مجھے لوٹ ہی لیا ہے یار۔۔۔“

”اوسرچی، اسی گل نے ہی تو ہماری جان نکالی ہوئی ہے۔“ وہ خیالوں میں گم ہوتے ہوئے بولا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا اور کوئی بات نہیں کی۔ جب ہم کھانا کھا چکے اور میں ٹھنڈا سوڈا اٹلٹ سے اتار رہا تھا تو وہ بولا

”اب ہماری قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے سرجی، بتا دلو، ہوگا، یا مجھ سے شادی کرے گی۔۔۔“

”یہ دونوں باتیں نہیں ہوں گی“ میں نے سکون سے کہا

”کیا مطلب، بھر کیا رقم واپس کرے گی وہ۔“

”کون سی رقم، جب تم نے اسے کوئی رقم دی تھی تو مطالبہ کیا۔ تم جھوٹ بولتے ہو اور میرا مشورہ یہی ہے کہ آئندہ اسے تنگ مت

کرنا۔ ورنہ میں بھی تمہارے خلاف ہو جاؤں گا۔ اسے اپنے حال میں جینے دو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ شدت حیرت سے بولا۔

”وہی جو سچ ہے۔ تم سراسر اس پر الزام لگا رہے ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ جو وہ کہہ رہی ہے ٹھیک ہے۔ مثلاً تم نے اس کا چہرہ ہی نہیں دیکھا

اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کی باتیں کرتے ہو؟“ میں نے اُکتاتے ہوئے کہا

”آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے؟“ وہ غصے میں بولا

”یہ کہ اس کے چہرے پر سرے سے کوئی حس ہی نہیں ہے۔ تمہیں اتنا تو پتہ نہیں اور تمہیں لگانے چل دیئے ہو۔“ میں نے سکون سے کہا تو

اس نے ندامت سے میری طرف دیکھا اور چپاٹی سے اٹھ کر گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔



کانچ کا مسیحا

”کانچ کا مسیحا“ محمد فیاض ماسی کا تحریر کردہ یہ خوبصورت ناول صفتی مہارانی سے لے کر صفتی حقیقی تک کے سفر کی

انوکھی داستان ہے۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے امیر زادے کی جو اپنا گھربار، دولت، زمین جائیداد سب کو خور کار کر حق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا

ہے۔ معرفت کے اس راستے میں اس نے کیسے کیسے امتحان دیے، کبھی پاؤں میں ٹھکر دیا، کبھی گلی ناچا اور کبھی کشکول اٹھا کر در بدر کی

خاک چھانی۔ رانی، ایک ہندو لڑکی جو اپنے مذہب سے ہزار اور حق کی پرستار ہے۔ وہ خالق حقیقی کو پانے کی جستجو میں سرگرداں اس نوجوان

تک پہنچ جاتی ہے اور پھر تقدیر ان دونوں کو ایک انوکھے اور پاکیزہ بندھن میں باندھ دیتی ہے۔

”کانچ کا مسیحا“ کتاب گہر دستیاب ہے۔ جسے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وجہ خاص

میں جس فلیٹ میں رہتا تھا اس کی بلڈنگ کے کس کئی دنوں سے مجھے ایسی عجیب نظروں سے گھور رہے تھے، جسے میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ میں حال ہی میں وہاں شفٹ ہوا تھا۔ چند لوگوں کو جانتا بھی تھا لیکن ان سے میل جول نہیں تھا۔ مجھے اپنے کام سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ ان سے تعلق بڑھا تا۔ کھانا میں باہری سے کھا کر آتا۔ آتے ہی میں اپنے کام میں مصروف ہو جاتا اور اس وقت تک بیڈ پر نہیں جاتا تھا جب تک اپنا کام ختم نہ کر لیتا۔ بس یہی ایک عادت اچھی تھی۔ آج کا کام مکمل پر نہیں چھوڑتا تھا۔ تب حالت یہ ہو جاتی کہ دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا اور نیند سے آنکھیں پھل پھل ہو جاتیں۔ بیڈ پر جاتے ہی ہوش نہ رہتا کہ میں کہاں ہوں۔

میرے ارد گرد رہنے والے لوگوں کا رویہ نظروں کی حد تک بدل گیا تھا۔ سیلو پلو تک تو بات پہلے بھی تھی۔ پہلے کئی دن تک وہ ٹھیک بھی رہے تھے۔ مگر اچانک ان کی نگاہوں میں اجنبیت کے علاوہ کوئی ایسا جذبہ تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ مجھے شدید الجھن ہونے لگی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت جیسا کوئی طغی تھا۔ اس رویہ کے ساتھ ہی خاص تہذیبیاں آگئیں۔ اب بلڈنگ کا چکیدار میری آمد تک ہشاش بشاش رہتا۔ میری موٹر سائیکل کو دیکھ کر ایسے چمکتا ہو جاتا جیسے میں کوئی اہم شخصیت ہوں یا کوئی بڑا سرار چیز۔ جب کے پہلے وہ اونگتا ہوا پایا جاتا تھا۔ بند دروازے ہلکی سی جھری کے ساتھ کھل جاتے۔ باہر سے میں قہقہا نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اندر سے کون دیکھ رہا ہے لیکن میرے گزر جانے کے بعد دروازے بند ہو جاتے تھے۔

میرا فلیٹ تیسری منزل پر تھا اور میرے راستے میں تین بلب پڑتے تھے جو اکثر فلوڑیا غائب ہوتے مگر اب وہاں نئے بلب لگے ہوئے تھے، جو بھی روشن تھے۔ رضوی صاحب اور سلمیٰ صاحب پہلے شطرنج کی بازی اپنے اپنے فلیٹ پر بنایا کرتے تھے لیکن اب وہ باہر راہداری میں بیٹھنے لگے تھے۔ میری طرف متوجہ ہونے کے باعث وہ اپنی چالیں اور مہرے بھول جاتے اور میں انہیں آداب کہہ کر گزر جاتا۔

میں خود حیران تھا کہ آخر وہ لوگ میرے بارے میں اتنا تجسس کیوں رکھتے ہیں میں کوئی اتنا خاص اور اہم بندہ نہیں تھا، بس ایک مقامی اخبار کا اسٹاف رپورٹر تھا۔ جو سارا دن شہر کی خاک چھاننے کے بعد اخبار کے دفتر چلا جاتا۔ سورج ڈوب جانے پر وہاں سے نکل کر اس ہوٹل کی جانب نکل جاتا جہاں سے میں کھانا کھاتا اور کھانے کے بعد احباب سے گپ شپ کر کے رات گئے اپنے فلیٹ کی جانب لوٹ آتا۔

بہت دن گزر گئے ان کے رویہ سے میں پریشان تھا۔ آخر ایسی کون سی بات سی جو یہ لوگ مجھ سے نہیں کہتے؟ اتنی عجیب نظروں سے مجھے کیوں گھورتے ہیں؟ میرے بارے میں تجسس کیوں رکھتے ہیں؟ اب تو مجھے خوف آنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دیکھی چیزوں سے خوف محسوس

ہوتا ہے۔ جیسے جیسے میں بلڈنگ کے قریب جاتا دیکھتا ہوں۔ طبیعت میں بھاری پن محسوس ہونے لگتا۔ میڑھیاں ہنسنے لگتی ہیں۔ پھر ایک دم ماحول بدل گیا۔ اب چوکیدار مجھے دیکھ کر نظر انداز کر جاتا۔ رضوی اور سلہری صاحب کی بساط نہ جانے کہاں جمتی۔ کوئی دروازہ اب نہیں کھلتا تھا۔ دوپہر سے پہلے جب میں نکلتا تو کوئی نوجوان مجھے دیکھ کر نہیں ہنستا تھا۔ بلب پھر سے فیوز ہونے لگے تھے۔ یوڑھی عورتوں نے گھورتا بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں تیوروں پر تل نہیں ڈالتی تھیں۔ بلکہ کوئی نہ کوئی ایک آدمی ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی نواز دیتی۔ اب یہ ماحول بھی میری سمجھ سے بالاتر تھا، کیونکہ یہ دونوں قسم کے رویے میں نے ان کی آنکھوں تک محدود دیکھے تھے، کسی نے مجھ سے بات تک نہ کی تھی۔ بس چوکیدار تھا جو مجھ سے بات کر لیتا، وہ بھی حال احوال کی حد تک۔ جب کبھی میں اسے تھوڑے بہت پیسے دیتا۔ ایک دن معمول کے مطابق اٹھا تو سر بہت بھاری تھا۔ اٹھنے کو ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی کوشش کر کے اٹھ بیٹھا مگر اٹھتے ہی ایسا زوردار چکر آیا کہ میں دو بار دو بیڑ پر آن کر۔ تھوڑی دیر بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے اچھا جائزہ لیا۔ مجھے تیز بخار تھا۔ اس دن میرا جان لازمی تھا۔ مگر اس حالت میں جان نہیں سکتا تھا۔ میں نے ہمت کی اور دروازہ تک گیا باہر بھاگتا تو کوئی نہیں تھا۔ اوپری منزل پر سنا تھا میں نے ہمت کی اور نیچے اتر آیا قریب ہی ایک دکان سے میں نے اپنے دفتر فون کر کے بتایا کہ اس وقت میری حالت کیا ہے۔ والہس بیڈ پر پکڑنے تک مجھے اتنی تھکاوٹ ہو چکی تھی کہ آنکھوں کے سامنے تاریں ناچ رہے تھے۔

پہلے نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے غصہ سے زود آواز میں اندر آئے تو کہا تو وہ میری ساتھی اسٹاف رپورٹر مس تانیلہ راتھور تھی۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر خالد تھے انہوں نے آتے ہی خوش دلی سے کہا:

”ہوں تو جناب! آج کل صاحب فرما رہے ہیں۔“

”آہ.....! یہی تو معلوم نہیں ہوتا کہ آخر کسی کے غم میں؟“ تانیلہ نے شوقی سے کہا۔

”کیوں بھی بولتے کیوں نہیں؟“ ڈاکٹر نے جیسے ہوئے کہا۔

”اور تو کوئی غم نہیں سوائے غم روزگار کے۔“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ تانیلہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر نے لپو لکھ دیا۔ پھر وہ ڈاکٹر کے ساتھ اٹھ گئی اور دروازے سے باہر نکلا کر کہا: ”میں ابھی میڈیسن لے کر آ رہی ہوں۔“ خاصی دیر بعد وہ لوٹی۔ وہ نہ صرف دوائیاں لے کر آئی تھی بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر مقدار میں لے آئی تھی۔ کچھ پھل میرے قریب رکھ کر حکم صادر کیا کہ جلدی سے کھا لو تاکہ پھر دوائی بھی کھانی ہے۔ وہ کچن میں گھس کر نہ جانے کیا باتیں کر رہی اور پھر میرے قریب آ کر بولی ”میں نے کچھ چیزیں فریج میں بنا کر رکھ دی ہیں۔ دوائی لے لینا۔ کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ تمہارا کام میں سنبھال لوں گی۔ جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ تم بن بھاری مٹھلیں زیادہ دن تک نہ سوئی رہیں۔ میں کل پھر آؤں گی اور ہاں رات اگر کوئی کام کیا تھا تو مجھ سے دو۔“

میں نے رائٹنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے اپنے مطلب کی چیزیں اٹھالیں اور چلی گئی۔ اگلے دن وہ پھر آئی اچھا کام چمک کر دیا اور مزید معلومات لے کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ میری طبیعت قدرے ٹھیک تھی۔ میں یہ سوچ کر دفتر چلا گیا کہ کام وغیرہ نہیں کروں گا مگر طبیعت تو سنبھل جائے گی۔

سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں نائیلہ کے آنے سے یہ لوگ برا محسوس نہ کر گئے ہو۔ ایک اکیلا اور اوپر سے نو جوان۔ جہاں اس کے پاس ایک اکیلی لڑکی کا کیا کام؟ اسی شام مجھے پھر دینی اذیت ہوئی۔ ان لوگوں کی نظریں دوبارہ بدل گئیں۔ اب عمرانی کرنے والے معمولات تو نہیں تھے لیکن کسی کی نظریں میرا مذاق اڑا رہی تھیں کسی آنکھ میں طعنا تھا، کوئی فحاشی سے دیکھ رہا تھا، کوئی حقارت سے اور کسی کی نگاہیں غصے سے بھری ہوئیں تھیں۔ میں ایسی ہی نظروں کے حصار میں بمشکل اپنے فلیٹ تک پہنچا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟ ایک دفعہ جی میں آیا کہ ہلڈنگ ہی چھوڑ دوں مگر کیوں؟ اسی سوال کے جواب میں یہی سوچنا رہا کہ آخراں کے دیے میں تبدیلی کیوں ہے؟

سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں نائیلہ کے آنے سے یہ لوگ برا محسوس نہ کر گئے ہو۔ ایک اکیلا اور اوپر سے نو جوان۔ جہاں اس کے پاس ایک اکیلی لڑکی کا کیا کام۔ مگر پہلے تو نائیلہ نہیں آتی تھی۔ تب انہوں نے ایسا رویہ کیوں رکھا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند آگئی اور پھر پوہ ہی نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔ صبح اٹھا تو پھر حرارت تھی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ اس دوران نائیلہ کے ساتھ دوسرے کارکن ساتھ بھی آتے تھے۔ چند دن بعد میں بھلا چکا ہو گیا۔ میں نے ہلڈنگ والوں کے بارے میں سوچا اگر ان کا یہی رویہ رہا تو مجھے کیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے برا ہی سمجھتے ہوئے تو سمجھتے رہیں۔ اب جب کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تو میں کسی سے کیوں پوچھوں؟ جب کوئی بات کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں کیوں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اتنا ہلکا ہوں۔ ایسا کئی دن چلتا رہا اب میں نے توجہ دینی چھوڑ دی۔

اس دن منہ پر پانی میں پہلا پتھر مسز عظیم نے مارا۔ میں بیڑھیاں اتر رہا تھا اور وہ سامان سے لدی اوپر آ رہی تھیں۔ زیادہ سامان کی وجہ سے وہ کانپ رہیں تھیں میں ازا رو بہر دوری انہیں سامان پہنچانے کی پینکشنس کی۔ جیسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ میں سامان لے کر تیسری منزل پر پہنچا تو انہوں نے سامان دروازے پر ہی رکھ دینے کو کہا۔ اور اس وقت تک دروازہ نہ بجایا جب تک میں واپس جانے کے لیے نہ مڑ گیا۔ رات جب میں واپس آیا تو ایک خط دروازے سے نیچے اندر پھینکا ہوا۔ کھول کر پڑھا تو مسز عظیم کی بیٹی عافیہ کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے میں ان کے دروازے تک آیا بھی لیکن اس کی ماں کی وجہ سے اندر نہ جا سکا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک خاص وجہ سے مسز عظیم نے مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مگر وہ خاص وجہ نہیں لکھی۔ اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہی وہ خاص وجہ ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔

میں عافیہ کو جوا بجا جذباتی سا خط لکھ کر وہ خاص وجہ معلوم کر سکتا تھا مگر ایسا کرنے میں گھٹیا کام سمجھتا تھا۔ میں اس لڑکی کے جذباتی پن سے بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا لیکن میرا خیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ میں نے اس خط کو بالکل نظر انداز کر دیا اور پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ایک رات جب میں اپنے کام میں محو تھا۔ ساری ہلڈنگ میں خاموشی طاری تھی ان پر سکون لحاظات میں مجھے ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ میرا قلم جیڑی سے چل رہا تھا کہ اچانک دروازے پر زور دستک ہوئی۔ میں بری طرح چونک گیا ان پر سکون لحاظات میں کوئی دروازے پر دستک دے اور وہ بھی بری طرح انتہائی بدتمیزی سے تو اعصاب تلخ کر رہے جاتے ہیں۔ غصہ میرے دماغ میں اچانک بھر گیا، کوئی تمیز ہوتی ہے دروازہ بجانے کی۔ یہ تو اجنبی کی انتہا تھی۔ میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی بھی ہو کمری کمری سنا دوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرا جاننے والا اتنا گنوار نہیں ہو سکتا۔ اسی اثنا میں دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کیا باہر سے آنے والا مردوں کو زندہ کرنے کی کوشش میں ہے جو

یوں دھماکے کر رہا ہے۔ میں نے غصے سے قلم رکھا۔ شپ ریکارڈر بند کیا اور اپنے آپ کو پرسکون حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمبے اسی حالت میں گزرے تو دروازے پر پھر دھماکہ ہوا۔ میں گولی کی طرح آنکھ کر دروازے تک گیا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔ سب سے آگے ہلڈنگ کا ایک نوجوان جو انگریزی قلم کے ہیرو کی نقالی کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بڑے ایکشن میں تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے ہی جیالے تھے ان کے پیچھے رضوی اور سلہری صاحب تھے۔ کچھ اور بزرگ ٹائپ لوگ تھے۔ چند خواتین بھی تھیں اور چند دروازے جھری کی حالت میں کھلے تھے۔ ایک تو میرا داغ پہلے ہی تھا ہوا تھا اور پر سے اتنی بھیل بھاڑ دیکھ کر چکر گیا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں ان لوگوں نے یہ تو فرض نہیں کر لیا کہ میں فوت ہو گیا ہوں۔ مگر یہ لوگ اتنے بااخلاق نہیں ہو سکتے، بات کچھ اور ہی ہے۔ میں ابھی اس واقعہ کو سمجھ ہی رہا تھا کہ وہ انگریزی قلموں کا قلعی ہیرو مجھے ایک طرف دھکیلا ہوا کرے میں ٹھس گیا۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے اس کا کارڈ پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔

”اوسٹر اس کی اجازت سے اندر جا رہے ہو۔ جو بات ہے دروازے سے باہر کمرے ہو کر کرو۔“ اس نے میری بات کا جواب تھنڑکی صورت میں دیا جو میرے دائیں کان کے اوپر لگا۔ اب میرا داغ بالکل ہی محوم گیا۔ میں نے اسے پوری قوت سے اٹھایا اور باہر راہداری میں پھینک دیا۔ دو وہیں سٹ گیا اور اٹھ نہ سکا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کے تاثرات میرے حق میں بدلے ہوئے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے لپکھو نرم کر کے کہا ”فرمائیں کیا بات ہے اور کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”ہم تمہارے کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔“

”اس طرح؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا۔ آپ لوگ پہلے مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ یوں کیوں میرے کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔“

”ہمیں تم پر شک ہے؟“ ایک جیالا بڑے غصیلے لہجے میں بولا۔

”کس بات کا شک ہے۔“ میں نے حیرانگی سے کہا۔

”وہ تمہیں موشبوت ابھی دکھاتے ہیں۔ سیدھی طرح اندر آنے دو ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا کر لو گے۔“ میرا قصہ انتہا کو چھو رہا تھا۔ ”تمہیں آنے دوں گا اندر، تم لوگ جو چاہے کر لو۔“ اور ساتھ ہی میں نے دروازہ بند کر لیا غصے کی لہر نے میرا داغ ماؤف کر دیا۔ باہر سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں میں اپنے اعصاب کو پرسکون کرتا رہا۔ میں اس اتفاق سے بُری طرح بھنبھلا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی اتفاقی جو میری بالکل ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کون سی خاص وجہ ہے جس کی وہ لوگ جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ کتنے ہی لمبے گزر گئے باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ پھر اچانک دروازے پر دستک دی گئی اور یہ دستک لگا تاروی گئی تو میں دھاڑا ”کون ہے؟“

”پولیس۔۔۔۔۔ دروازہ کھولیں۔“ میں اچانک گڑبڑا گیا۔ یہ پولیس کہاں سے آ گئی؟ دروازہ کھولا میرے سامنے انسپکٹر شاہد تھا جو مجھے اچھی طرح جانتا تھا مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”ارے آپ یہاں.....!“ وہ بولا۔

”ہاں مجھے یہاں آئے ہوئے تھوڑا سی عرصہ ہوا ہے اور کیا تم مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہو؟“

”چلو اندر چل کر بیٹھیں۔“ شاہد نے اندر بھاگتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے راستہ دیا۔ ساتھ آئے پولیس مین کو اس نے وہیں رہنے کا اشارہ کیا۔ صوفے پر نکلنے کے بعد میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا: ”یہ لوگ آپ پر الزام لگا رہے ہیں کہ آپ یہاں اپنے کمرے میں عورت لے کر آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ بھول ان کے کہ وہ یہاں ایسی غلامت برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ آپ کو زنگے ہاتھوں پکڑ کر بلڈنگ سے لٹا نا چاہتے ہیں۔“

”یہ سراسر الزام ہے، تہمت ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ میرے قلت کی تلاشی لے سکتے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن میں اگر آپ سے یہ کہوں کہ کیوں نہ بلڈنگ والے ہی اپنا اطمینان کر لیں؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ چند لمحوں بعد وہ فلی بیرواپے چند ساتھیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اور وہ سارے کمرے میں ”عورت“ تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہاں کچھ ہوتا تو تھا۔ جب ان کی تلاش ختم ہو گئی تو میں نے باہر موجود سب ہی کو بلایا۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ میں نے براہ راست انپکٹر شاہد کو متوجہ کر کے کہا

”ان سے پوچھیں ان کا اطمینان ہو گیا ہے؟“

”نہیں ہمارا اطمینان نہیں ہوا۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”کیوں نہیں اطمینان ہوا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”وہ اس لیے کہ ہم نے خود اندر سے نسوانی آوازیں سنی ہیں اور رات گئے بار بار سنی ہیں۔“ میرا منہ کھلا رہ گیا۔ خدا را یہ کیا الزام ہے۔

ٹائیکلہ کبھی آتی بھی تھی تو دن کے وقت اور واپس چلی جاتی تھی۔ رات کے وقت کوئی عورت؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی؟

”میں آپ کو یقین.....“ ایک اور شخص نے میری بات کاٹتے ہوئے فوراً چند مکالمے سنا دیے جو میرے اور اس ”عورت“ کے درمیان

آج رات ہی ہوئے تھے۔ ایک دم ہی مجھے وہ مکالمے سن کر خیال آیا کہ یہ ان کی شدید غلط فہمی ہے اور جو سراسر ان کے جا بے جا شک کی بنیاد پر ہے۔ اب میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ میں اٹھا اور اپنی کھینے والی میز تک گیا۔ وہاں پر موجود ٹیپ ریکارڈر میں پڑا ہوا کیسٹ تھوڑا سا پیچھے کیا۔ اور پھر اس کو دوبارہ چلا دیا۔ اس میں سے ایک عورت وہی مکالمے ادا کر رہی تھی۔ جو ابھی اس شخص نے مجھے بتائے تھے۔ یہ ایک فلی اداکارہ کا انٹرویو تھا، جو میں دو، تین روز قبل ہی شپ کر کے لا یا تھا۔ اور رات کو کیسٹ ریکارڈر کی مدد سے اس انٹرویو کو لکھ رہا تھا۔ تاکہ اخبار میں شائع کیا جاسکے۔ میں نے سب کی طرف دیکھا، وہ لوگ کھیانے سے ہو کر ایک ایک کر کے چلے گئے۔ انپکٹر شاہد نے معذرت کی اور چلا گیا۔ میں اس وجہ خاص پر دیر تک ہنستا رہا۔



دھواں میں تحلیل چہرہ

میں نے ہائیک بند کر کے اسٹینڈ پر لگائی تو یکدم سنا مچا گیا۔ بیوہ کی آنکھوں کی مانند وہ جگ مگی ویران تھی۔ میں نے اپنے بند گھر کا تالا کھولا ہائیک تھسٹ کر اندر کھڑی کی اور بستر پر جا لی۔ جھکن سے جوڑ جوڑ ڈکھ رہا تھا۔ نیند آنکھوں میں تھکتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُنھ کر کپڑے تبدیل کئے اور باہر کا دروازہ لگانے لگا تو میری نظر سامنے گھر پر پڑی جو روشن تھا، صبح تک وہ گھر بے آباد تھا۔ میں اس بارے میں مزید سوچنے کی زحمت کئے بغیر بستر پر لیٹا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا میں کہاں ہوں۔

اگلی صبح میں دفتر جانے کیلئے نکلا تو اس گھر کے سامنے ایک خوبصورت سا بچہ کھڑا تھا۔ میں ہائیک کھڑی کر کے مکان کو تالا لگانے لگا تو اتنی دیر میں وہ بچہ میری ہائیک کے قریب آن کھڑا ہوا۔ میں نے اسے پیار کیا تو وہ اپنی توکی زبان میں کہنے لگا۔

"اٹل..... مجھے سیر ترائیں۔" بڑا بے تکلف بچہ تھا لیکن میں اب اس کو کہاں سیر کرانے لے جاتا؟ میں نے پیار سے کہا۔

"دیکھو بیٹا میں جارہا ہوں، شام کو سیر کراؤں گا..... اب آپ جائیں۔" وہ فوراً ہی مان گیا اور چلا گیا۔

اگلی صبح پھر وہی ہوا، دفتر جانے کیلئے نکلا تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس نے پھر مجھے سیر کرانے کو کہا تو میں نے پھر ٹال دیا۔ اس طرح اس کے فوراً مان جانے کی وجہ سے میں دو تین دن تک اسے ہٹا رہا۔ اس دن پھٹی تھی۔ میں ناشتہ کر کے شاؤنک کرنے نکلا تو وہ بچہ مجھے نظر نہیں آیا۔ واپسی پر بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بچے کی معصومیت کا احساس ہوا، دل میں خیال آیا کہ اس بچے کی خواہش پوری کرنی چاہئے مگر کس طرح؟ یوں بچے کو بلا کر ہائیک میں بٹھا کر لے جاتا مجھے عجیب سا لگا اور سوچا کہ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے اور گلی محلے والے کیا سوچیں گے؟

یہی سوچ کر اس خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ میرے پوچھا کا تھا، میری پھوپھی اور ان کے تین بچے جن میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بڑے خوش و خرم یہاں دن گزار رہے تھے کہ اچانک پوچھا ایک حادثے میں وقت پا گئے۔ انہوں نے یہاں کاروبار شروع کر رکھا تھا جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا کزن عارف ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ان کی وقت کے بعد میری پھوپھی ہمارے ہاں چلی گئیں اور مجھے حکم صادر ہوا کہ اس کاروبار کو میں سنبھالوں۔ پھر مجھے نہ چاہئے ہوئے بھی اپنی تعلیم اور حوری چھوڑ کر ان کا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ میرے والد اچھے خاصے زمیندار تھے اور مجھے ضرورت بھی نہ تھی مگر پھوپھی کے بچوں کے مستقبل کی خاطر مجھے قربانی دینا پڑی۔ ہوشلوں میں رہنے کی وجہ سے مجھے اکیلا رہنے کی عادت پڑ چکی تھی سو مجھے زیادہ اکیلا پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس دن میں اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ کسی نے تیل دی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو ایک اویڑ عمر کے صاحب کھڑے تھے اور ان کی گود میں وہی بچہ تھا۔

”جی فرمائے؟ سلام کا جواب دینے کے بعد میں نے پوچھا۔

”یہ بچہ آپ کو روزِ جنگ کرتا ہوگا؟“ وہ بولے۔

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں..... آئیں اندر تشریف لے آئیں۔“ میں انہیں لے کر اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر باتوں کے بعد وہ کہنے لگا۔

”پتا ہے یہ میرا اس کا باپ چند ہفتے ہوئے ہیں باہر ملک چلا گیا ہے۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھی جو اب بیچ دی ہے۔ وہ اس کو بہت گھماتا رہتا تھا اور مجھے تو موٹر سائیکل چلانا نہیں آتا۔ یہ روزِ شام کو باہر نکل کر آپ کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ پھر جب آپ نہیں آتے تو رونے لگ جاتا ہے۔“

”اوہ۔ سوری صدیقی صاحب! ہوتا یوں ہے کہ مجھے صبح جانے کی جلدی ہوتی ہے اس لئے میں اس معصوم کی خواہش پوری نہیں کر سکا۔ بہر

حال! آج شام اسے گھملاؤں گا۔“

اسی شام عدنان کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر آوارہ و گھومتے ہوئے مجھے خوب بڑا حشر آ رہا تھا کہ کبھی کبھی بے مقصدیت میں بھی بڑا حشر آتا ہے۔ میں نے اسے آکس کریم کھلائی۔ دو چار کھلونے لے کر دیئے اور رات ڈھلے میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔

صدیقی صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، دونوں ہی ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو پرہیزی تھیں۔ حال ہی میں ان کا تاجدار اس شہر میں ہوا تھا۔ یہی وفات پانچگی تھی۔ بڑی بہو بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی جبکہ چھوٹے بیٹے عدیل کی یہی بہن کے ساتھ تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ان کے ساتھ اچھے مراسم ہو گئے۔ عدنان کو گھماتا، ویسے بھی اب میرا فرض بن گیا تھا اس کے ساتھ میری اُنسیت بھی بہت ہو گئی تھی۔ یوں دن گزرتے چلے گئے۔

ایک رات جب واپس آیا تو خوبصورت سالخوردہ دروازے کے ساتھ ہی پڑا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو ایک نہایت نفیس کاغذ کے اوپر انگریزی میں ایک دو جملے لکھے ہوئے تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں خود پر تھوڑی سی توجہ دوں تو زیادہ پیسہ کمائی دے سکتا ہوں کوشش کر کے دیکھوں۔ فقروں کے اختتام پر لکھا تھا۔ ”آپ کو اچھا دیکھنے کی خواہش رکھنے والی۔“ میں بہت حیران ہوا۔ اس قسم کا خط میں نے زندگی میں پہلی دفعہ پایا تھا۔ کون ہو سکتی ہے یا ہو سکتا ہے؟ ایک لمحہ کو میں نے سوچا مگر پھر اسے مذاق سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ خطوں کا تاجدار بندھ گیا، دوسرے تیسرے دن ایک خط آ جاتا، جس میں چند جملے انگریزی میں ہی لکھے ہوئے تھے اور ان جملوں میں میری ذات میں گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا اور اس خط کے بعد تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگا، جس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں..... میرا دل شرب ہو جاتا ایک فطری عمل تھا، تجھ جس بھی تھا کہ کون ہے اور کیا کوئی دوست مذاق کر رہا ہے یا واقعی کوئی لڑکی ہے، اگر لڑکی ہے تو سامنے کیوں نہیں آتا چاہتی اور ایسا کر کے وہ کیا چاہتی ہے؟..... خط اسی شہر سے آتا تھا اور ہمارے ملاقات کے پوسٹ آفس کی مہر لگی ہوتی تھی۔ وہ مجھے اس قدر قریب سے دیکھتی تھی کہ اسے یہ تک معلوم ہوتا کہ میں نے کس دن شیو کی ہے، کس دن نہیں..... وہ اپنے خطوط میں بڑی مستقل مزاج تھی۔ وہ لکھتی رہتی کہ میں تمہیں قسم کا بھرا اسٹائل خوالوں، مٹلاں طہر کے کپڑے پہنوں۔ میں نے اس کی کسی بات پر عمل نہیں کیا جس پر وہ احتجاج بھی نہیں کرتی تھی۔ جس خط میں اس نے لکھا تھا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں، اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اس کو جواب دوں، اس صورت میں کہ اس کے بتائے ہوئے کپڑے پہنوں۔ میں نے ایسا تو

کچھ نہ کیا لیکن دل میں ٹھان لی کہ اب اس کا سراغ لگا کر ہوں گا۔

ان دنوں معمول سامن گیا تھا کہ میں عدنان کو ہر جمعہ کے دن سیر کروانا، صدیقی صاحب دوپہر کے بعد میرے پاس بیٹھے رہتے اور ہا امرارات کا کھانا اپنے ہاں کھلاتے جس پر خاصا اہتمام ہوتا تھا۔ ان کی بہو کی میں نے صرف آوازی تھی اور ان کی کسی بیٹی کو آج تک نہیں دیکھا تھا۔ خطوط کی آمد بدستور اسی طرح تھی اور میری سوچ اسی چکر میں غلاں و چچاں رہتی کہ دو کون ہو سکتا ہے یا ہو سکتی ہے؟ بہت دفعہ خیال صدیقی صاحب کی بیٹیوں کی طرف گیا کہ وہ جب سے آئے ہیں۔ خطوط کی آمد بھی ان کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔ وہی مجھے انتہائی قریب سے دیکھ سکتی ہیں مگر کون سی، چھوٹی والی یا بڑی؟ کسی کا میں نے چہرہ تک نہیں دیکھا تھا کہ اس سے اندازہ ہو جاتا۔ میں ایک ماہ اس چکر میں رہا لیکن مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ خطوط کی آمد اسی طرح تھی جس میں اب یکسانیت تھی۔ یہ فقرہ ضرور ہوتا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔

ایک رات اچانک مسلسل بل بجتے سے میری آنکھ کھل گئی میں دروازے پر گیا تو سامنے صدیقی صاحب کی بہو پریشان کھڑی تھی۔
”خیریت تو ہے؟“

”وہ ایسا کچھ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ پلیز، کسی ڈاکٹر کو بلوادیں۔۔۔ مجھے پتہ نہیں ہے ورنہ۔۔۔!!“

”آپ جائیں میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی اور کچھ دیر کے بعد پھلپلی گلی میں رہنے والے ڈاکٹر کو میں ساتھ لے گیا۔ اس نے ان کی حالت کافی سیریس بتائی۔ فیذا میں صدیقی صاحب کو اسپتال لے گیا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا لیکن طبی امداد ملنے کے باعث وہ خطرے سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ چند دن اسپتال میں رہے اور پھر گھر آ گئے۔ میں رات گھر آنے کے بعد ان کے پاس کچھ دیر کو ہوا تا لیکن ان لڑکیوں کی موجودگی کے علاوہ میں ان کی بھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔ البتہ اب ان کی بہو عصمت میرے سامنے آ جایا کرتی۔

ایک عرصے تک خطوط پاتے رہنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ جو کچھ بھی کہے گا یا کہے گی میں اس پر عمل کروں گا، کیونکہ اگر یہ شرارت ہوتی تو بہت جلد وہ اکتا جاتا کیونکہ ایسے چکر میں نتیجہ کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔ اب مجھے یہ بے معنی تھی کہ جو کوئی ہے سامنے آ جائے۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر میں وہی کرنے لگا جیسا مجھے کہا جاتا۔

ایک رات کا دوسرا پہر تھا کہ اچانک تل بجی۔ میں دروازے پر آیا تو ایک لڑکی کھڑی تھی، اندھیرے میں بس یہی دیکھ سکا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا یا پوچھتا، وہ اندر آ گئی اور دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ ٹک لگا کر گہری، گہری سانس لینے لگی۔ میں حیران و پریشان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک آہستہ سے میرے منہ سے نکلا۔

”کون ہو تم.....؟“

”میں.....“

یہ کہہ کر بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر یکدم ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ رات تنہائی، جوان لڑکی اور اس سے اگھرتی ہوئی جھگی پر لہو کی سمور کن خوشبو، سب کچھ دیوانہ بنا دینے کیلئے کافی تھی۔ لیکن یکدم ہی میں اس حصار سے باہر آ گیا۔ میں نے اسے خود سے طہرہ کیا تو

اس کی آنکھیں گویا نئے سے بھری ہوئی تھیں، خوبصورت چہرے پر تراشیدہ ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ پھر میں اسی حصار میں میں چپٹے چپٹے رہ گیا اور ہارنگلی میں نکل کر دیکھا تو وہ اب بھی کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی ہوئی تھی۔ چندا دارہ کتے گلی کی گز پر بیٹھے تھے اس سرد موسم میں کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ ہارنگلی کے اندر اک آگ میری خطر تھی..... میں دلچسپ آیا تو وہ میرے پیڈ پر دراز ہو گئی تھی۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھا تو اس کی خوبصورتی کی دل ہی دل میں تعریف کئے بتا نہ رہ سکا، میں بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا اور بس اس سے اتنا ہی پوچھ سکا کہ خطا دی لکھتی ہے؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں ہی لکھتی ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری محبت قبول کی۔“

پھر اس کے بعد بیس ہوش نہیں رہا کہ کہاں ہیں، یہ جادو اس وقت ٹوٹا جب صبح کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ پھر وہ چلی گئی لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ میں اس سے پوچھ سکوں کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی اور اس کا نام کیا ہے؟ اب خطوط آنا بند ہو گئے تھے لیکن میرا ذہن ہر وقت ادھر ہی اٹکا رہتا، جس سے یقیناً میری کارکردگی متاثر ہوتی تھی۔ میں جلد ہی سنبھل گیا اور اب یہی ایک تنہا تھی کہ میں معلوم کر لوں کہ وہ کون تھی جو پوری رات مجھے ہوش سے بیگانہ کئے رہی اور خود بھی بکھر کر سستی رہی۔ فطری طور پر طبیعت میں جھجک ہونے کے باعث میں اتنی کوشش نہ کر سکا کہ کہیں کسی بھی غلط اقدام سے چھوڑا یا بد کردار انسان کے طور پر نہ جانا جاؤں، میں اسی انتظار میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح معلوم کر لوں۔ یہ بہر حال مجھے یقین تھا کہ ان ہی میں سے ایک ہے۔ میں بھی اس کیل میں بھی لذت محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر ویسی ہی ایک رات اور آگئی۔ بتل گئی اور وہ بے دھڑک اندر آ گئی، انداز میں وہی جنون اور آگ تھی جس سے چند لمحوں میں آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اس سے پہلے کے میں بے خود ہو جاؤں میں نے اس سے کئی سوال کر ڈالے۔ وہ چند لمبے سوچتی رہی پھر اپنی انگلی ٹپکٹیں اٹھا کر کہتی چلی گئی۔

”میں اس شدت سے آپ کو پیار کرتی ہوں کہ میں آپ کو مٹا نہیں سکتی، سرد راتوں میں تنہا آپ کے پاس چلی آتی ہوں اس سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے آگے بار دیا ہے۔ میں نے بہت سوچا اور بار بار سوچا ہے لیکن میں اور آپ کبھی بھی ایک بندھن میں نہیں بندھ سکتے، یہ جاننے کے باوجود میں اس دل کے باتھوں مجبور اور بے بس ہوں اور آپ کو چاہے چلی جا رہی ہوں، ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کڑھے میں چھلا تک لگا دی ہے یا منزل کے قریب پہنچ چکی ہوں، لیکن مجھے یہ پختہ یقین ہے کہ میں کسی اور کی دلہن بنوں گی۔ میں اپنے آپ سے بار کے صرف اپنی غرض اور اپنے آپ سے مجبور ہو کر چلی آتی ہوں۔ میں بڑھوں یا بڑوں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ آپ میرے ہارے میں نہ جائیں تو بہتر ہے۔ میں کل کسی کی ہو جاؤں گی تو اس طرح آپ مجھے خواب سمجھ کر جلد بھول جائیں گے۔ آگئی کے دکھ سے بچ جائیں گے اور قہقہے تو یہی لیے ہوتے ہیں نا بس انہی کو امر کر لیں اور مجھے بھی حسرت نہ رہے کہ کسی کو چاہا بھی اور اس کے قریب نہ ہو سکی۔ میں نے آپ سے پیار کیا ہے اور میں ہی آگے بڑھ کر اپنے حصے کے لیے سمیٹ لیتی ہوں۔ کیا یہی کافی نہیں کہ میں آپ پر مرتی ہوں اور مجھے یہ احساس بھی ہے کہ یہ خوش چند روز کی ہے۔ پلیز مجھے میری خوشیوں سے محروم نہ کریں اور اگر آپ کو یہ چھان نہیں لگتا تو میں نہیں آؤں گی۔“

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ آخری دم تک چلوں۔“

”مجھے معلوم ہے کہ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکے گا اور آپ کا میرے بارے میں نہ جانتا ہی بہتر ہے۔ باقی رہی نام کی بات تو آپ جو چاہے کہہ

لیا کریں۔“

پھر وہ یونہی میری بے چینی اور بے کیف راتوں کو سہانے لگی۔ جس رات آتی، ذرا مکی اپنے پورے جوین پر جا کر ٹکھ جاتی۔ ان راتوں پر میری دسترس نہیں تھی، وہ جب چاہتی آ جاتی۔ کبھی دوسرے ہی دن اور کبھی طویل وقفے کے بعد..... اگرچہ میرے اندر اس کے بارے میں جھٹس تھا لیکن میں نے اس کے کہنے پر نہ تو کوشش کی اور نہ پوچھا۔ بس یہ یقین تھا کہ وہ وقت کے ساتھ خود ہی بتا دے گی۔ مجھے خود بھی اس کے بارے میں جاننے کی اتنی جلدی نہیں تھی۔ یوں آنکھ مچولی میں کئی ماہ گزر گئے۔

اچانک ایک دن اس کا خط آیا کہ اب میں آپ سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔ وقتی طور پر چند دن میں ڈسٹرب رہا کیونکہ اس کے آنے کی، اس کے انتظار کی عادت سی بن گئی تھی۔ پھر میں نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ میرے سامنے والے گھر میں ہی تو رہتی تھی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح بھی اس کو دیکھوں گا اور اس سے بات کروں گا کہ یوں کیوں آنا ترک کر دیا۔ یہ مسئلہ اس وقت حل ہوتا نظر آیا جب ابوبی طرف سے پیغام ملا کہ میری امی اور چھوٹی بھینجی تمام بچوں سمیت چند دنوں کیلئے آرہے ہیں۔ وہ میری بہن کی شادی کیلئے شاپنگ کرنے آرہے تھے۔ اگلے دن وہ آ گئیں۔ شام ڈھلے جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ارد گرد کے ہمایوں کے علاوہ صدیقی صاحب کے یہاں سے بھی ان کی بیوی اور بیٹیاں آئی تھیں۔ امی ان کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔ صبح جاتے وقت میں نے عارف کو سمجھایا کہ جیسے ہی صدیقی صاحب کی بیٹیاں ادھر ہمارے گھر آئیں تم فوراً مجھے فون کر دینا۔ اس نے ایسے ہی کیا اور میں جتنی جلدی ہو سکا گھر پہنچا۔ عارف نے اشارے سے بتایا کہ اندر ہیں۔ میں چپکے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا کھڑکی کا پردہ ڈرا سا ہٹا کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ معمولی شکل صورت کی لڑکیاں جنہیں ذرا بھی خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ پر حیرت کا پہاڑ یہ ٹوٹا کہ اگر وہ ان میں سے نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ یہ مہم میرے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا۔ میری آمد کا احساس ہونے پر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ میں نے یونہی تصدیق کی خاطر پوچھا کہ یہ کون تھیں تو جواب ملا صدیقی صاحب کی بیٹیاں تھیں۔ مجھے سب کچھ گھومنا نظر آ رہا تھا۔ میں تو آج تک انہیں میں سے ایک کو فاذی سمجھ رہا تھا۔ یہ حیرت اپنی جگہ الگ تھی۔ ساری سوچیں سلب کر دینے والی بات یہ تھی کہ فاذی کون تھی؟ پورے ایک ماہ اسی الجھن میں گزر گیا لیکن یہ جتنی سلجھائے سلجھ نہیں رہی تھی۔ میں ہر وقت یہی سوچتا رہا جاتا میں یہ سوچ کر لرز جاتا کہ کہیں وہ جیلز تو نہیں تھی جو انسانی روپ میں مجھے ملتی رہتی تھی مگر یہ سب ماننے کو ذرا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ تقریباً ایک سال گزر گیا اور میں اس بات کو بھول گیا وقت کی گرد نے اس کی یاد کو بہت حد تک مائل کر دیا تھا۔

اس رات فاذی کا خیال میرے ذہن میں دو دو رنگ نہیں تھا مگر اس وقت حیرت سے میں منگ رہا تھا جب وہ میرے بیڈروم میں میرے سامنے کھڑی تھی شاید دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آن بیٹھی۔

”کیسے ہیں آپ.....؟“

”تم..... کہاں چلی گئی تھی اور تم کون ہو؟“

”یہی تو بتانے آئی ہوں۔ ہم صدیقی صاحب کے ساتھ اوپر والے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی توجہ ہی نہیں دی کہ میں کب سے آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔ ہم تین بہنیں ہیں۔ میں نے جب آپ کو خط لکھا تھا تو اس دن سے بہت پہلے میں نے اپنے اندر آپ کی محبت کو پایا تھا۔ پھر یہ اس قدر پر دان چڑھی کہ جنون کی حد تک میرے حواسوں پر چھا گئی، مگر میری مشکلی ہو چکی تھی جو میرے چاہنے سے بھی نہیں لوٹ سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے قتل کر دیتے لیکن غیر برادری میں میری شادی ہرگز نہ کرتے۔ میں خط لکھ کر اپنی حسرت پوری کرتی رہی مگر آپ نے اپنے کسی انداز سے بھی مجھے یہ احساس نہیں دلایا کہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میں بدنامی کے خوف سے آپ کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔ میں شاید گھٹ کر رہ جاتی مگر آپ نے میرا مان رکھ لیا اور میں نے اپنا سب کچھ آپ پر نچھاور کرنے کی ٹھان لی۔ میں اس رات اتنی مجبور ہوئی کہ اپنا دل باغہ کر آپ کے دروازے تک چلی آئی۔ میں خود اپنی شناخت چھپا رہی تھی تاکہ آپ کے دل میں میرے لئے جذبہ پیدا ہو بھی جائے تو آپ مجھے تلاش نہ کر سکیں۔ میں اپنی حسرتیں پوری کرتی رہی اور پھر میری شادی ہو گئی اور میں اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ آپ سے ملنے کو میرا دل بہت چاہ رہا تھا مگر مجھے یہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال آخری بار آج آپ سے اس لئے ملے آئی ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں۔ کہیں آپ ساری عمر میرے بارے میں الجھتے نہ رہیں....“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ میں نے اسے پہلے کی طرح رات بھر کیلئے روکنا چاہا لیکن وہ رُک نہ سکی بلکہ ہوا میں تحلیل ہو جانے کی مانند وہاں سے چلی گئی۔

چند ہی دن بعد وہ مجھے پھر نظر آئی۔ گلی میں اپنے بچوں اور مہماں کے ساتھ آ رہی تھی۔ مجھ پر اس کی نظر پڑی لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رت ایک رات کے برابر بھی نہ تھی یوں جیسے اجنبی ہو۔ میں فاقی اور اس عورت کے بارے میں بڑی دیر تک تجزیہ کرتا رہا تبھی میرے اندر سے کوئی آواز آئی۔ ”فاقی کا طرز عمل ٹوٹ کر چاہئے یا محبت کا نہیں تھا بلکہ ہوس تھی جو نہ دلوں میں جکھلتی ہے اور نہ کوئی یاد کا کلواؤ بن میں چھوڑتی ہے۔“ میں اپنی جگہ مطمئن ہو گیا۔ آج جب میں اس کو سوچتا ہوں، اس کو یاد کرتا ہوں تو اس کا چہرہ مجھے دھوکے میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔



جانور

وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ زندگی سے بھرپور آنکھیں لئے بڑی باوقار شخصیت کا مالک۔ دو وجہ یہ بھی تھا لیکن اس کی ساری وجاہت ان چند معمولی جوزوں کی وجہ سے ختم ہو جاتی تھی جو وہ پچھلے برس سے پہنتا چلا آرہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ تعلق فقط ”ہیلو، ہائے“ تک محدود تھا۔ جیسے کہ دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ میرے حساب سے ان عام سے طالب علموں میں سے ایک تھا جنہیں پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں ایسے عام سے لوگوں کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ میرے اپنے چند مخصوص دوست تھے جو زندگی کے ہر لمحے سے خوشی کشید کر لیتا جا رہے تھے۔

ہم تو موسم، رنگ، خوشبو اور چروں کی باتیں کرنا پسند کرتا تھا کہ زندگی کے اس پہلو کے بارے میں جہاں نا آسودہ خواہشیں، حسرتیں، اُمیدیں اور خواہشیں، زندگی کا دامن پکڑ کر آؤ بکا میں معروف ہوتی ہیں۔ جبر اور ظلم کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ میں پڑھنے کی کوئی فکر نہیں تھی اور نہ ہی ذمہ داری حاصل کرنے سے رغبت، ہم تو فقط یونیورسٹی کا ماحول انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ شباب کی بذلہ سنجی، فضل کی طعناں میز تہرہ آرائی، نیلہ کی زندہ دلی، الوینہ کی جدید دنیا کے بارے میں معلومات، وقاص کا بے تحاشا دعوتیں کرنے کا شوق اور مجھے نئی گاڑیاں بدلنے کا جنون۔ ہم سب مل گئے تو ماحول لطف دینے لگا۔ اس دوران کے عام لوگوں کا خیال رہتا ہے؟

شاید دوسرا سال بھی ہمارا اس سے اچھی طرح متعارف ہوئے بغیر ہی گزر جاتا کہ اچانک ایک دن الوینہ نے انکشاف کیا۔
”وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے، اسے دوست بنانا چاہئے۔“

پہلے تو اس کا خوب مذاق اڑایا گیا کہ کیا کبھی ہے۔ اسے یہ یاد کرانے کی کوشش کی گئی۔ ”اسے عشق و محبت کہتے ہیں اور یہ جراثیم! اسے کہاں سے لگ گیا۔“ وقاص نے اسے تڑتاتے ہوئے کہا۔

”یار! کچھ تو خیال کرو۔ اپنے اسٹیشن کا احساس کرو۔ وہ تمہارے ایک گھنٹے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا اور مجھے اُمید ہے کہ اسے گاڑی میں بیٹھنے کی تیز بھی نہیں ہوگی۔ اگر عشق کرنا ہے تو اس بندے سے کرو جو تمہارے تمام قسم کے خُرقے برداشت کر سکے۔“

”اور ہاں ...!“ فضل کہاں چپ رہ سکتا تھا۔ ”کہیں یہ نا ہو کہ تم کھانے پینے کی فرمائش کرو تو وہ تمہیں گول مچے، آلو چھو لے یا زیادہ سے زیادہ شندھی بوجھ پڑھا دے۔“

”ہاں الوینہ! اسے تو یہ تک پتہ نہیں ہوگا کہ نیل پاش کے شیڈز کتنے ہوتے ہیں۔“ نیلہ نے ہنس کر کہا تو وہ قہقہا لگتی۔

”خدا کیلئے میری بات تو سنیں، وہ مجھے اچھا اس لئے لگتا ہے کہ وہ اچھا ہے، ڈیجین ہے، باصلاحیت ہے اور تم لوگوں کو اظہارِ عبادتوں کے قائل نہ

اس کیلئے بیٹے جذبات رکھتی ہے۔“

”قائزہ؟ وہ جو سر پر بڑا اسادو پہنے لٹکائے رکھتی ہے؟“ شہاب چمکا۔

”بالکل وہی۔“ نیلہ نے تصدیق کر دی۔

”ہاں! وہ ٹھیک ہے۔ لوئر مڈل کلاس کی لڑکی اس طرح کے لڑکے کے ہی خواب دیکھ سکتی ہے جو ایک پھول تھمے دینے پر خوش ہو جاتی ہیں اور سوطر کی امیدیں وابستہ کر لیتی ہیں۔“ وقاص نے غصے سے کہا۔

”اور ہاں سوری الوینہ، اگر تم نے اس سے دوستی رکھی تو پھر ہم تم سے دوستی نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ اس لیے کہ وہ ہمارے لئے اور ہم اس

کیلئے مس لٹ ہیں۔“ میں نے شدید حسد سے کہا۔

”تم سب اپنی باتیں رہو گے یا کچھ میری بھی سنو گے؟“ الوینہ نے شدید غصے میں کہا۔

”کیو...“

”وہ اچھا اس لئے لگتا ہے کہ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔ یعنی پڑھتا ہے، کتابیں اس نے کھلائی ہیں اور قائدہ ہم اُٹھائیں گے؟“

”اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے تو ہماری دوستی پر ناز ہوگا۔“

”جی مجھے بھی کنگے حاشق بنانے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ تو میں کسی رومانوی ناول کی اور نہ ہی وکٹورین عہد کی کسی فلم کی ہیروئن ہوں۔ بلکہ اس

جیتے جاگتے ماحول کا حصہ ہوں جس میں عشق و محبت کا معیار بھی دولت ہے۔“

رزلٹ کے اعلان کے ساتھ ہی جہاں میں نے اپنا رزلٹ دیکھا، وہاں لاشعوری طور پر اس کے مارکس بھی دیکھے۔ وہ کوئی پوزیشن نہیں لے

سکا تھا مگر پھر بھی مجھے نمبر پر تھا۔ میرے خیال میں اسے گولڈ میڈل ملنا چاہئے تھا لیکن یہ اعزاز اسے نہ ملا دیکھ کر میرے اندر کا حاسد شخص خوش ہوا۔ کیا قائدہ

اتنا پڑھنے کا؟ اس کے بتائے نوٹس، ہم جیسوں کے پاس ہونے کی ضمانت تھیں۔ اس کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ نہ خدا ہی ماننا وصال منم۔ وہ بے چاری

قائزہ اس کے التفات کے لئے ترستی رہی جب کہ وہ اپنا مستقبل بنانے کے چکر میں اسے نظر انداز کرتا رہا پھر ایسے لوگ عشق وغیرہ کہاں انورڈ کر سکتے

ہیں۔ میں لاشعوری طور پر اس کے بارے میں سوچتا چلا گیا کہ اب یہ اپنی ڈگری اٹھائے نوکری کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ اس کے پاس اگر دینے کو

رشوت اور ساتھ میں سفارش ہوگی تو ہی ڈگری کی وقعت تسلیم کی جائے گی ورنہ ڈگری کا غذا کا کلو اسی ثابت ہوگی جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

پھر بہت سارے دن بیت گئے؟ ایک دن وہ مجھے فٹ پاتھ پر کھڑا نظر آ گیا اور میری توقع کے عین مطابق اسی پرانی وضع کا لباس اس کے

جسم پر سجا، اس کے حالات کا تسلسل بیان کر رہا تھا۔ غربت اور بے روزگاری جس کے اہم جز تھے۔ ناچا جتے ہوئے بھی میں نے اس کے قریب بریک

لگا دیئے، وہ ایک لمبے میں مجھے پہچان گیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تو اس نے قدرے سلیپے سے انکار کر دیا کہ ابھی بس یاد لیکن آ جائے

گی۔ میں نے اسے اصرار کر کے بٹھالیا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جو میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن بات کا سرا نہیں مل رہا

تھا آخر اس نے ہی خاموشی توڑی۔

”آپ کے دوسرے دوستوں کا کیا حال ہے؟“

”میں نہیں کہی۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا اور فوری سوال داغ دیا۔ ”سنا تھا فائزہ کے ہارے میں بڑا۔“

”پاگل تھی وہ خواہ خواہ بلا سوچے سمجھے ایک ایسی راہ پر چلنا چاہتی تھی جہاں گڑھے اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔“

”ایسی بھی کیا بات تھی؟“

”میری اپنی مجبوریاں ہیں، مجھ پر بوجھ ہیں، ذمے داریاں ہیں۔ مجھے ان سے فرصت ملتی تو اس کا ذکر پال سکتا تھا اور پھر ہر کام وقت کے

مطابق کرنا چاہئے جبکہ وہ وقت سے پہلے حالات کو قابو میں کرنا چاہتی تھی۔“

”معذرت خواہ ہوں میں، آپ کی بات سمجھنے ہوئے بھی نہیں سمجھ سکا۔“

”میں نے کوئی مشکل بات تو نہیں کہی، سیدھی سی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکے اور لڑکی کے تعلق کا آغاز اور انجام شادی تصور

کیا جاتا ہے۔ میں اس سے تعلق بدھاتا تو بات معنی اور پھر شادی تک جاتا تھی۔ میں فی الحال یہ انورڈ نہیں کر سکتا۔ میں خود بے روزگار ہوں، اپنے

بیروں پر کمزرا ہونا چاہتا ہوں۔ بیمار ماں کے علاج، چھوٹی بہن کی شادی کے اخراجات پورے کرنا ہیں، چھوٹے بھائیوں کو پڑھانا ہے۔ اتنے عرصے

میں وہ بوجھ بھی نہیں ہو جائے گی کیا؟“

آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ ذرا ہنس دیا تھا۔ تبھی میرے اندر انسانی ہمدردی نے جوش مارا۔ ”اگر آپ کہیں تو میں کسی سفارش وغیرہ کا

بندوبست کروں۔“

”نہیں.....! میں ناامید نہیں ہوں۔ میرے اچھے مارکس ہیں۔ میری اکیڈمک، ہسٹری شاعر ہے۔ مجھے اگر اپنے اخراجات پورے کرنے

کیلئے وقت نہ نکالنا پڑتا تو شاید میں ناپ کر جاتا مگر مجھے اتنا وقت..... خیر مل جائے گی نوکری، بہر حال آپ کا بہت شکریہ۔“

دوسری دفعہ بھی وہ مجھے اسی طرح ایک بس اسٹاپ پر کھڑا مل گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ شکست و کھائی دے رہا تھا۔ اس بار اس کی باتوں میں بڑی

مایوسی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا۔ میرے لئے قطعاً حیرت انگیز نہ تھا، ایسا ہونا ہی تھا۔ کب تک وہ ڈگری ہاتھ میں پکڑے حالات کا مقابلہ کرتا رہتا،

اعصاب جھنجھنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے اپنی فکر نہیں میری ضرورت تو بس اتنی ہے کہ پیٹ بھر روٹی مل جائے لیکن جب اپنے بڑے ہاے باپ کے کھردرے ہاتھوں، کانٹوں پر

جھکی کمزور نظر اور بڑھ حال جسم کو دیکھتا ہوں تو شرمندگی کی عمیق دلدل میں ڈھنس جاتا ہوں۔ بڑھی تیار ماں اب خود مجھ سے نظر چراتی ہے۔ بہن کی جوانی

دکھوں کا حصہ بہن کر میرے وجود کو جکڑ چکی ہے۔ بھائیوں کے تاریک مستقبل کا خوف مجھے پاگل بنادینے کیلئے کافی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ خواہ خواہ

ی پڑھتا چلا گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی میرے ہاتھ میں بیچ کس پلاس ہوتا یا پھر میں کسی ہوٹل میں بہرا گیری پر ماسور ہو جاتا تو آج اچھا موٹر سیکلنگ ہوتا، کئی

میرے جیسے چھوٹے میرے ہاتھ سے ہنر سیکر رہے ہوتے یا پھر میں کسی چھوٹے موٹے ہوٹل کا مالک ہوتا۔ اب تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں۔ میں اپنے

سارے خیالات، ساری ذہانت اور ساری تعلیمی کمائی ایک طرف رکھ کر اب یہ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن ذہنی روح پر مزید تیرہنے کی سکت نہیں۔ کتابوں میں

پڑھنے کے لئے حروف میری زندگی میں روشنی پیدا نہیں کر سکے۔ یہ تو ایک دیمک کی مانند ہیں جو روح کے ساتھ ساتھ جسم بھی چاٹتے جا رہے ہیں۔“
میں خاموش رہا اور کچھ نہ بولا وہ کہتا چلا گیا۔

”وہ لوگ مجھے بڑے عجیب لگتے ہیں جو دنیا کو بدل دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان خیالات، عزائم اور یقین سب کا غدی باتیں ہیں۔ چائلڈ لیبر پر کئے گئے سیمینار، ورکشاپیں اور تحقیق فضول لگتی ہیں۔ کتنے بچے ورکشاپوں سے اٹھا کر اسکول میں داخل کرائے گئے ہیں۔ کتنے بھرا گیری ختم کرائے گئے ہیں مگر وہ تعلیم کیوں حاصل کریں جس کا مستقبل ڈگری اٹھانے کے لئے کھانا ہے۔ دو ہر امعیار تعلیم ایک جمہوری معاشرے میں کیوں؟ روٹی کا چکر ایک پھندے کی طرح ہمارے گلے میں ہے جس کا دوسرا سرا اسی زمین کے ناخداؤں کے ہاتھ میں ہے تو پھر۔۔۔“
وہ کہتے کہتے رک گیا اور ایک آہ میں سارے لفظ دم توڑ گئے۔ ”تعلیم فتنہ نوکری حاصل کرنے کیلئے تو نہیں حاصل کی جاتی۔“ میں نے کمزور سی دلیل دی۔

”میں مانتا ہوں مگر ان غریب غرباء کا کیا کیا جائے جو کپڑے کوڑوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کے پاس تعلیم کا سرمایہ ہوتا ہے جو یقیناً بے کار ہوتا ہے۔ ان کے پاس روپیہ ہے۔ یہ تو انہیں تعلیم سے رغبت ہی کیوں ہو اور پھر تعلیم فتنہ چند کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں۔ بگاڑ تعلیم کا نہیں اور نہ ہی غریب میں صلاحیتیں کم ہوتی ہیں بلکہ بگاڑ تو ان لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے جو حقدار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ تعلیم کی صحیح تعریف نہ جاننے والے تعلیمی بورڈ کے کرتا دھرتا ہیں۔ ہوس کے بندے مفاد کا لہو چاٹ رہے ہیں۔“

میں نے اسے پاگل اور بے مصرف سمجھ کر سڑک کے کنارے اُتار دیا کہ یہ بھی لفظوں کی دلدل میں پھنس گیا ہے پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا کبھی کبھار وہ یاد آ جاتا تو میرا تصور مجھے بڑے عجیب منظر دکھاتا میں دیکھتا، وہ کسی فٹ پاتھ پر پڑا بجیک مانگ رہا ہے اس کی وہ وجاہت اور جوانی معاشی عنقریب نے نگل لی ہے۔ کبھی سوچتا وہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے حالات کی جکی میں پس رہا ہوگا یا پھر رشوت حاصل کرنے کے نت نئے طریقے سوچنے میں اس کا وقت گزرتا ہوگا تاکہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کیا جاسکے یا پھر وہ کسی ایسے گروہ کے ساتھ شامل ہو گیا ہوگا جو انوائبرائے تاوان، ڈکیتی یا قتل جیسے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہوں گے یا شاید کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔ خود کشی کر لی ہوگی۔

یہی تو المیہ ہے اس لوڑ میڈل کلاس طبقے کا یہ لوگ زیادہ تر خوابوں اور خواہشوں کی انگلی پکڑ کر پلٹے ہیں۔ ماں بیٹے کو ”بڑا آدمی“ دیکھنا چاہتی ہے۔ باپ محنت کرتا پاگل ہو جاتا ہے کہ اولاد کی روٹی پوری ہو جائے۔ اس کے ہر طرح کے سکھ کے احساس کے عوض وہ اپنے مستقبل کا سہارا بنانے کی فکر میں ہوتا ہے، بہنوں کی آس بنتا ہے۔ رشتوں کی زنجیر میں جکڑ کر رہ جاتا ہے۔ پیٹ پالنا مجبوری بن جاتا ہے۔ ان کی خواہشیں چھوٹی، خوشیاں چھوٹی، لیکن غم دکھ اور ڈھسار یاں بڑی بڑی ہوتی ہیں۔

اس بار جب میں نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکا۔ وہ مشہور فائبر اسٹار ہوٹل میں ایک خوب رو حسینہ کے ساتھ جدید تراش کے ڈنر سوٹ میں بیٹھا کم از کم مجھے وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہا تھا۔ میز پر اپنی ہینڈ سکرپٹ اور نفیس ترین لائٹرز کے ساتھ موبائل فون پڑا تھا۔ اس کی وجاہت بھی لوٹ آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تاثر تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا، شاید سکون تھا یا اطمینان۔ میں خود اس کی طرف

بڑا حالکہ کھینچتا چلا گیا۔ حسب سابق وہ فوراً ہی مجھے پہچان گیا۔ رکی جملوں کے جادو لے کے بعد اس نے اس خوب و حسینہ کا تعارف اپنی دوست کی حیثیت سے کرایا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتیں رہیں پھر یہ سوال اس وقت زبان سے پھسل ہی گیا جب وہ حسینہ اٹھ گئی۔

”یہ تہہ ملی کیوں اور کیسے؟“

اس نے معیہ کی سے کہا۔ ”مختصر ایوں سمجھ لو کہ میں نے جان لیا ہے کہ میں جنگل میں رہ رہا ہوں اور یہاں قانون بھی طاقت والے کا ہے پھر میں نے راز پالیا کہ طاقت کیسے حاصل کی جاتی اور یہ طاقت کس چیز میں ہے اس کیلئے مجھے پہلے پہل اپنی اٹا اور خوداری کی قیمت دینا پڑی جن کی حیثیت یہاں دو کوڑی بھی نہیں ہے۔“ اس نے زک کر سگریٹ سٹگا کی اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”میں اس جنگل میں کتے کی طرح روٹی کی تلاش میں پھرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اور بہت سے کتے بھی ہیں جو قصائی کی دوکان تک جا کھینچتے ہیں اور وہاں سے بڈی اٹھا کر چومتے ہیں اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اس جنگل میں بھڑیے بھی ہیں جن کی خوراک زندہ گوشت ہوتا ہے جنہیں وہ بھجھوڑتے ہیں۔ میں ایسے ہی گوشت کا بیو پارہ بن گیا ہوں جو کچھ دیر کیلئے رہن رکھا جاتا یا یوں سمجھ لو کہ جیسے گوالہ دودھ حاصل کرنے کیلئے بھینس پال لیتا ہے یا کوئی اٹھنے حاصل کرنے کیلئے مرغیاں، بالکل اسی طرح میں نے چند جسم پال لئے ہیں جن کی حیثیت بھینس یا مرغی سے زیادہ نہیں لیکن میری تجوری بھر رہی ہے، اب میں انسان بن رہا، میری روح اور ضمیر مردہ ہیں۔ میں خواہشوں کا غلام وہ جانور ہوں جو اس جنگل میں اسی طرح زندہ رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔“

وہ چند لمبے خاموش ہوا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”اور ہاں! اگر آپ کو کسی سفارش کی ضرورت ہو تو مجھے کہیے گا۔“

اور میں سوچنے لگا کہ اپنے نئے پروجیکٹ کیلئے جو سرمایہ قرض لینا ہے اس کیلئے اس کی خدمات حاصل کر لوں۔



اُردو طنز و مزاح

”اُردو طنز و مزاح“ مجموعہ ہے سرسید احمد خان سے لے کر محمد خالد اختر تک کے مشہور اور معروف مصنفین کے طنزیہ

حراشیہ مضامین کا جسے شیماء مجید نے انتخاب اور کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ شیماء مجید اُردو کی مشہور محقق اور مرتبین میں شامل ہیں اور ان کی کئی کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مقالات حسن عسکری، فیکسیر کے ذراے، شباب نامہ، منصور حلاج اور اُردو طنز و مزاح شامل ہیں۔ زیر نظر کتاب سرسید احمد خان سے لے کر محمد خالد اختر تک ۳۳ مختلف مصنفین کے ۳۷۷ تحریروں پر مشتمل ہے جس میں، مضامین، کہانیاں، آرٹیکل، کالم اور خاکے شامل ہیں۔ امید ہے اُردو ادب کے مداحوں کو یہ کتاب یقیناً پسند آئے گی۔

”اُردو طنز و مزاح“ کتاب گمر ہ دستیاب ہے۔ جسے طنز و مزاح مضامین سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

صلیب وقت

وہ اپنے کمرے میں کمز کی کے پاس آرام کر رہی تھی۔ بظاہر اس کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔ مگر وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ کا مرا اس فنکشن کی یاد سے شروع ہوا جو رات یونورٹی میں بہت دھوم اور جوش و خروش سے ہوا تھا۔ اس فنکشن میں اس کے ڈیپارٹمنٹ کا الگ سے پروگرام تھا۔ وہ سارے ساتھی جنہوں نے پورے دو سال ساتھ گزار دیئے تھے۔ ایک دوسرے سے چمکھڑتے ہوئے ایک نامعلوم سے دکھ کے حصار میں آ گئے تھے۔ ان میں کسی کی کسی سے بے تکلفی بھی تھی۔ کوئی ایک دوسرے کا دوست اور کوئی ان میں ایسا بھی تھا جو چہرے کی حد تک شامسا کہا جاسکتا تھا، انہیں ایک دوسرے کے نام اور رول نمبر تک معلوم نہیں تھے مگر اس وقت سب اپنے اپنے لگ رہے تھے۔ ان میں سہیل بھی تھا۔ جہاں سے ہمیشہ سے ہی منفرد لگا تھا وہ مسلسل اسے گھورتا رہا تھا اور وہ اسی تسلسل سے ڈسٹرب ہوتی رہی تھی۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح فریض نہیں تھا اور نہ ہی اس کی باتوں میں وہ روانی تھی۔ بس خاموش خاموش سا تھا۔ اگر کوئی بڑھ کر اس سے بات کر لیتا تو اس کا مختصر سا جواب دے دیتا اور نہ یونہی بد دل مر جھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ایک طرف بے ہوئے اسٹیج پر سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ طرح طرح کی آوازیں میڈک اور نجانے کیا بلا گئی۔ یوں تو اووی تقریب قریب قریب ہی مگروں لگتا تھا جیسے سہیل نے کچھ زیادہ ہی محسوس کی ہے۔ جیسے یہاں بہت کچھ چھوڑ کر جا رہا ہو۔ وہ بھی اس کے پاس گئی تھی۔ اسے یاد نہیں اس نے سہیل سے کون سا رکی جملہ کہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ جینپ گئی اور پھر بات نہ کی۔ تبھی وہ اسٹیج کی جانب بڑھا اور مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سہیل نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں پھر کہنے لگا۔

میں ٹھیک سے تری چاہت تھی جتنا نہ سا

کہ میری راہ میں حائل تھے مسئلے تیرے

یہ درد کم تو نہیں کہ تو ہمیں نہ ملا

یہ اور بات ہے کہ ہم بھی نہ ہو سکے تیرے

وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنا چاہ رہی تھی۔ پھر فنکشن کا اختتام تک وہ ایک نامعلوم سے دکھ کی کک محسوس کرتی رہی۔

سہیل اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ اس نے اسی دن اس کے خوابوں پر تسلط بحال کیا تھا جب وہ لاہوریری کی میٹر حیاں اتر رہی تھی اور وہ میٹر حیاں چڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر اس کے ہاتھوں میں پکڑی کتاب پر پڑی تو وہ رک گیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "خاتون یہ کتاب آپ کب تک لاہوریری میں جمع کرادیں گی؟"

”کیوں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”مجیب اتفاق ہے کہ میں یہی کتاب لینے لائبریری کی طرف آ رہا تھا۔“ اس نے بڑے شائستہ اور مضمرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”پہلے آپ پڑھ لیجئے میں بعد میں پڑھ لوں گی۔“ اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ.....! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں آپ سے کتاب ہی چھین لوں۔ آپ نے پہلے کتاب ایٹو کروائی ہے اس لئے پہلے آپ کا حق بنتا ہے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا، اگر آپ نے برا محسوس کیا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھنے کیلئے قدم بڑھا دیے۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”پلیز ڈرائیو نہیں کیجئے۔“ وہ رک گیا۔ ”میں یہ کتاب کل ہی واپس کر دوں گی۔“

”شکریہ۔“ اس نے اتنا ہی کہا اور لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچتی رہی اور وہ رات چلتی تھی جو اس کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ اس کا مظہر اظہر الجہ، بالوں کا خوبصورت اسٹائل، لباس اور سے اٹھتی بھینٹی بھینٹی مہک، یہ اس سے پہلی ملاقات کا پہلا تاثر تھا، اور اس تاثر نے اس کی دنیا اُتھل چھل کر دی تھی پھر کلاس میں ایک ساتھ پڑھنے کے دوران میں اس کی مزید خوبیاں اسی طرح کھلتی چلی گئیں۔ اس کی ذہانت سے جہاں ساتھی طالب علم متاثر تھے، استاد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر کسی کے ساتھ اس کے حراج و معیار کے مطابق بات کرنا، پھر یوں ہوا کہ وہ اس کے قریب آنا چلا گیا۔ دنیا جہاں کے موضوعات پر بحث کا طویل سلسلہ ہوتا۔ ایک ایک موضوع کی دن چلتا۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ دوستی کی حد ختم ہو چکی ہے اور اب وہ اس سرحد میں داخل ہو چکی ہے جہاں ادھوری باتیں اچھی لگتے لگتی ہیں۔ لفظ کو کھلے اور بے تاثر ہو جاتے ہیں۔ خاموشی زبان بن جاتی ہے۔ خواہشیں نیا روپ لے لیتی ہیں۔ خواب رنگین ہو جاتے ہیں۔ دل ایک نئی لے پر دھڑکنے شروع ہو جاتا ہے اور فطرت اپنے تمام گہرے رنگ کے ساتھ عیاں ہونا شروع ہو جاتی ہے تب کئی دنوں تک آنکھ بھولی چلتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو جذبہ وہ اپنے اندر محسوس کر رہی ہے اور جن سے اسے اپنی دنیا کے بدل جانے کا احساس ہو رہا ہے کہیں کسی کمزور لمحے میں سہیل کے سامنے ان کا اقرار نہ کر بیٹھے۔ وہ سہیل کے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھنے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو آگ اس کے اندر جل چکی تھی وہ اس آگ میں تنہا ہی جلتا چاہتی تھی۔ شاید وہ جذلوں کی بارش میں بھیگی ہوئی کسی اس سے اقرار کر رہی تھی مگر سہیل بھی کسی سورج کی طرح اس کی نگاہوں کو خیر تو کیے رکھتا۔ اس کی دنیا میں اپنے ہونے کے احساس کی تمازت نکسیر تارہتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اس سے اشارے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا وہ بھی اسے چاہتا ہے۔ اس جیسی آگ میں وہ بھی جل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی نیند کا بوجھ لیے پھرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جذلوں کا اظہار نہ کر سکی۔ ایک جھجکتی تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی تھی اور جب وہ اپنے بوڑھے باپ پر نگاہ ڈالتی تو سہیل کی محبت چاہتیں دل کے کس کو نے میں سمٹ کر پوشیدہ ہی ہو جاتی اور اس کی جگہ باپ کی محبت لے لیتی۔ اس کا باپ ہی اس کیلئے سب کچھ تھا۔ ماں بن کر پالا اور اسے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ممتا اس کیلئے نایاب جذبہ ہے۔ اس کے باپ کی محبت تھی جو یوں اپنی جوانی کو بھی پشت وال کر چنی کی تربیت کرتے چلے گئے۔ وہ تمام آسائشیں اس کیلئے مہیا کیں جس کی وہ تمنا کرتی اور اب ان کی دنیا مکمل جیئر پر بیٹھے گھر کے دلمان، کمرے اور لان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ان پر قانع کا تملہ ہوا اور وہ پوری دنیا سے کٹ کر رہ گئے تب اس نے محسوس کیا کہ اب اسے باپ کی شفقت و محبت ہی نہیں

سینٹا بلکہ اب اس کے باپ کو اس کی محبت اور خدمت کی بھی ضرورت ہے۔ گویا اب اس کے باپ کی تمام دنیا اس میں سمٹ کر رہ گئی تھی اور یہی دفا کا تقاضا بھی تھا۔

اس کے باپ نے گھر میں ہی اپنا آفس بنالیا اور کاروبار کو سنبھال لیا۔ وہ صبح صبح اٹھتی اور اپنے اہا کی بیڈنی پہنچا آتی پھر انہیں لان لے جاتی۔ کچھ دیر ان کے ساتھ رہنے کے بعد اخبار تھا کر خود ناشتہ بناتی۔ ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتی پھر تیار ہو کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ دوپہر واپسی پر اپنے باپ کے ساتھ کھانا کھاتی۔ ان سے تھوڑی گپ شپ کرتی اور آرام کر کے پھر اپنے باپ کے ساتھ چائے پیتی۔ تب اپنے باپ سے سارے دن کی روداد سنتی جو تقریباً روزانہ ایک عرصے ہی ہوتی۔ ڈنر کے بعد انہیں دو آئی کھلا کر بید پر لٹا دیتی اور پھر اس کی اپنی دنیا سے اپنی طرف بلانا شروع کر دیتی۔ اس کے دو چار شے آئے بھی تھے، لیکن باپ کے منظور کر لینے پر بھی اس نے سختی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو یوں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو اپنی دنیا بسالے اور اپنے باپ کو نو کروں کے دم در دم پر چھوڑ دے۔

☆☆☆

”بیٹا آج تمہاری خالہ آئی تھیں۔“ جہاں آرا بیگم نے سہیل سے کہا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بینک سے لوٹا تھا اور کھانا کھا کر آرام کی خاطر بیڈ پر چلا تھا۔

”کیوں امی؟“ سہیل نے بے پروائی سے پوچھا۔

”یہ کہنے آئی تھیں کہ وہ اب نہت کی شادی کیلئے تیار ہیں تاکہ پھر صباحت اور راحت کے بارے میں سوچ سکیں۔“

جہاں آرا بیگم نے وہی بات کر دی تھی جس کا اسے پہلے ہی احساس تھا اور اس ذکر سے ہمیشہ ہی بچا کرتا تھا۔ اب انہوں نے یہ بات کہی تو

کسمسا کر رہ گیا جب وہ کافی دیر تک چپ رہا تو انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ ”پھر کیا کہتے ہو تم۔“

”امی میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”واقعی درد ہے یا بہانہ بنا رہے ہو؟“ امی نے کہا تو اس نے صاف صاف بات کرنے کی ضمان لی۔

”ہاں امی میں بہانہ بنا رہا ہوں۔ آپ کو میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا، اور میں نے آپ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ

آپ خالہ کو کہہ دیں کہ وہ نہت کی شادی کسی اور جگہ کر دیں پھر اب باقی کیا بات رہ جاتی ہے؟“

”بیٹا وہ تمہاری بچہن کی معیتر ہے۔ تمہاری خالہ کیا کہیں گی؟ نہت پر کیا گزرے گی؟ رشتے دار، برادری والے باتیں بنائیں گے۔ کچھ

تو خیال کرو۔“

”کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ نہت ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کیلئے رشتوں کی کمی نہیں ہوگی اور اب پلیز مجھ سے اس موضوع پر بات نہ

کھینچے گا۔ میں نہت ہی سے نہیں، کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا، یہ میرا فیصلہ ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی محفائش نہیں ہے۔“

”پھر میں انہیں کیا جواب دوں اور کیسے دوں؟“ امی نے زچ ہوتے ہوئے کہا تو وہ نمسے سے یولا۔

”آپ کوئی بھی بات نہ کریں ان سے، میں ہی کوئی ایسا جرم کر لیتا ہوں کہ وہ خود جواب دے دیں۔“ اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

”عجیب لڑکا ہے۔“ اس کی ماں اسے دیکھتی ہی رو گئی۔ وہ صحن میں بیڑ کے نیچے چار پائی پر آ کر لیٹ گیا اور اس کی سوچوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

ہاں ایک عجیب لڑکا ہی ہوں شاید اس لیے کہ میں نے اس عمل سے بغاوت کی ہے جس سے عام لوگ گزرتے ہیں۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ عام لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔ جو ایک نگہ بند محلے میں گزرتے ہیں۔ ذرا ہوش سنبھالا تو ماں باپ کو حالات کی جگہ میں پتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہیں اپنی غربت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن بچوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوانا چاہتے ہیں۔ وہ بچوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں اور اپنے بچے جب اپنے ہی جیسے گوشت پوست رکھنے والے دوسرے بچوں کو اچھی صحت اور اچھے لباس میں دیکھتے ہیں تو یا تو وہ احساس کسری کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں یا حسد کی آگ میں جھلنے لگتے ہیں۔ پھر وہ نا آسودہ خواہشوں کے صحن میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا حصول ان کیلئے خواب بن جاتا ہے پھر وہ کھٹے ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کی تمنائیں، ارمان، خواہشیں، سب کچھ کھلی کھلی آنکھوں کے خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے اسکول میں نہیں پڑھا تھا جہاں ایک ماہ کی فیس ان کے گھر کے پورے مہینے کا خرچہ ہوتی ہے۔ وہ ناٹ پر بندہ کر پڑھا مگر پھر بھی رہتا تو اس معاشرے میں تھا جہاں کسی کے بڑے ہونے یا چھوٹے ہونے کا معیار فقط دولت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اعلیٰ نوکری ہی کی مرہون منت ہے۔ اس کے باپ نے کتنی محنت سے دو کمروں پر مشتمل ایک گھر بنایا تھا۔ ساری پونجی لگا کر بھی قرض لینا پڑا تھا پھر بھی ایک طرف بنا کچا کرہ ان کی غربت کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ غربت ایسے چکر میں ڈالتی ہے کہ پھر سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کا بوڑھا باپ اب ریٹائرمنٹ کے بالکل قریب تھا اور ایک بہن تین بھائیوں کا مستقبل اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ کالج کی تعلیم مکمل کر چکا تھا تو باپ کے کچھ کہے یہ بات جان چکا تھا کہ اب اس کے باپ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مزید تعلیم دلوا سکے۔ وہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا لیکن مزید تعلیم کا شوق اس کے سامنے تھا۔ ناامیدی کے ماحول میں اب تو اس کا خواب ہی تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ پارت ٹائم جاب کر کے اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے لگا۔ اس نے اپنی ضروریات کو بڑی حد تک سمیٹ لیا تھا۔ اس کے پاس فقط ایک ہی زعمی تھی لیکن چار زندگیاں اس کے ساتھ بندھ چکی تھیں۔ بہن کی شادی کرنا تھی، چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلوانا تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بہن کی شادی کر دے تو بھائیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دے گا۔ وہ بھائیوں کا مستقبل روشن دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔ یہ بھی اس کا خواب تھا کہ شعیب ڈاکٹر بنے، رضا انجینئر اور منصور کے بارے میں ابھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن اس کو بھی بڑا آدمی بنانے کا خواب اس کی آنکھوں میں جھلکنا شروع ہوا تھا اور اس کی اپنی سب سے بڑی تمنا تھی کہ باہر جا کر تعلیم حاصل کرے اور اس مقام تک پہنچے جہاں کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ اکثر سوچتا یا تو اسے غریب گھرانے میں پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا یا ایسے خواب نہیں دیکھنا چاہیے تھے جو ایک روگ کی طرح چست کر رہ گئے تھے۔ یہ خواب پورے ہونے کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اسے احساس تھا کہ اگر اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر پانا ہے تو اس کی قیمت بھی چکانا ہوگی۔ اسے اگر کچھ پانا ہے تو کچھ کھانا بھی پڑے گا۔ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی نہیں کرے گا۔ اسے یہ یقین تھا کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی کیونکہ اسے یہ حصار

توڑنا تھا۔ فرہاد بن کر اس پہاڑ کو اپنی محنت کے لئے کوچہ چور کرنا تھا۔ غربت کو مات دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے نزدیک شادی کوئی منزل نہیں تھی بلکہ زادراہ تھی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ زادراہ بھی اس کیلئے بوجھ ہوگی۔ ایک پرسکون اور آسائش بھری زندگی کے حصول کیلئے اسے بہر حال محنت کرنا پڑے گی اور بھائیوں کو اگر وہ غربت سے نکال لایا تو آنے والی نسل احساس کمتری کا شکار نہیں ہوگی۔ وہ آنے والی نسل کا دکھ ابھی محسوس کر رہا تھا۔ ناامیدی کی کیفیت کا جو دکھ وہ سہہ رہا ہے انہیں نہ سہتا پڑے اور اس کیلئے کسی نہ کسی قوت قربانی دینا ہی تھی اور اس کیلئے وہ خود تیار تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور اپنا بوجھ خود اٹھالیا۔ اس احساس نے اسے حوصلہ مندی اور جرأت سے بھر دیا۔ اس کے خیال میں محنت لازمی شے تھی۔ جوانی کو وہ محنت کیلئے ہی مختص سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں جوانی کے دو حصے ہوتے ہیں جن میں سے ایک حصے میں ضرور محنت کرنا پڑتی ہے۔ اب یہ خود اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس حصے میں محنت کرتا ہے اگر وہ پہلے حصے میں محنت کرتا ہے تو دوسرے حصے میں آسودگی اس کا اعزاز ہوگی لیکن اگر وہ پہلے حصے کو متوا دے تو دوسرے میں بہر حال اسے محنت کرنا پڑے گی اور پچھلے حصے کا اخراج بھی اسے ادا کرنا پڑے گا پھر وہ محنت کا علم لے کر نکلتا کہ غربت کو متروک بنالے، پوری خود اعتمادی کے ساتھ۔

انسان کو خود کو چاہئے جتنا مضبوط بنالے لیکن کوئی نہ کوئی لمحہ اس کی زندگی میں در آتا ہے۔ اور ان لمحوں کو کنزور کر دینے میں جذبات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ کنزور لے کر دراصل اسی مضبوطی کا امتحان ہوتے ہیں اور پھر محبت جیسا خوبصورت جذبہ تو خود بخود کسی تیزی سے پھیلنے والی تیل کی طرح انسان کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے۔ سہیل بھی اسی پیٹ میں آ گیا۔ وہ کئی دنوں سے ٹھینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منفردی، بڑی بڑی آنکھوں والی معصوم سی دلکش لڑکی جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ایسی لڑکیاں بھی نہیں جو ننھے ماحول کے باعث سبھی سبھی نہیں مگر وہ بڑی بڑا اعتماد تھی۔ اپنی خوبصورتی کے باعث وہ سہیل کی آنکھوں میں ساکن تھی۔

پہلی ملاقات سے لے کر رات کی الوداعی تقریب تک جو دورانیہ انہوں نے یونیورسٹی کے ماحول میں گزارا اس کیلئے کشش کا باعث ضرور رہا تھا۔ ٹھینہ اس کے اس حد تک قریب آ گئی تھی کہ وہ اس کی ہنک اپنی سانسوں میں محسوس کرنے لگا تھا۔

اس رات جب الوداعی تقریب اپنے عروج پر تھی وہ ٹھینہ کے دھواں دھواں چہرے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ دو سال کی طویل رقابت سے وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ٹھینہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے یہ جتایا نہیں تھا مگر لاشعوری طور پر اس نے یہ احساس دلایا تھا۔ عام حالت میں اگر وہ اس کیلئے اپنے دل میں کوئی بھی جذبہ نہ رکھتا تو شاید وہ بھی محسوس نہ کر پاتا۔ وہ اسے اپنے من میں بسا تو چکا تھا لیکن کی جرأت اسے یکسر نہ تھی۔ غیر مرئی زنجیروں میں جکڑا وہ حالات کا قیدی، خود ہی اعتبار پر تعزیرات لگا چکا تھا۔ اس نے ٹھینہ کے ہارے میں جانے کی کوشش کی تھی اور یہی جانا غضب ڈھا گیا۔ آسانٹوں میں پللی وہ معصوم لڑکی اس کے چہونے سے گھر میں کس طرح گزارا کر سکے گی؟ نہیں وہ اسے کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔ پھر اس نے رات جاتے سے دکھ کی شدت کو شعروں میں بیان کر دیا وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھینہ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ کوئی عہد نہیں باعہد حا کوئی بیان نہیں کیا، وہ ٹھینہ نے بھی کبھی ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی سو وہ اس رات چھڑ گئے۔

☆☆☆

”سمیل بھائی مجھے یہاں کی ایک کپہی کی طرف سے ٹھیک ٹھاک آفر ہوئی ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے جو ان کو لوں یا باہر چلا جاؤں؟“ یہ منسور تھا جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن چکا تھا۔

”ارے منسور! کب تک میری انگلی پکڑ کے چلتے رہو گے۔ اب تم عملی زندگی میں قدم رکھنے جا رہے ہو۔ خود اعتمادی پیدا کرو اپنے آپ میں..... خود فیصلے کرو اب۔“

اس نے پیار سے کہا تو منسور اس سے لپٹ گیا۔ مہر سرائی کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ یہاں سکی مہر باہر لڑائی کروں گا۔ فارغ رہنے سے یہی بہتر ہے۔“

”اچھا جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو اور پھر فنی کو سیر کراؤ۔ کافی دیر سے ضد کر رہا ہے بلکہ سبھی کو لاد کر لے جاؤ ورنہ تمہارا گھر والا۔“

”جی اچھا۔“ منسور تو یہ کہتا ہوا اندر چلا گیا اور دولان میں کھیلنے ہوئے بچوں کو بڑی شفقت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ سامراور فنی شعیب کے بچے تھے اور خضر رضا کا بیٹا تھا۔ وہ ایک خشنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ ”اگر اس کے اپنے بچے ہوتے تو!“ یہ خیال اسے بہت آتا لیکن وہ یہی کہہ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ یہ سب بھی تو میرے ہی بچے ہیں۔ مجھے تایا ایلا کہتے ہیں۔ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میرے پاس سوتے ہیں۔ کوئی چیز مانگتا ہوتا میرے پاس آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی در آتا کہ اگر میرے بچے ہوتے تو وہ بھی یوں ہی میرے پاس آتے، میں بھی ان سے اتنا ہی پیار کرتا۔ ایک پھانس ہی اس کے گلے میں اٹک جایا کرتی پھر وہ اپنے ارد گرد سب کی محنتوں میں اپنے وجود کو بھلا دینے کی کوشش کرتا۔ وہ سب بھی تو ہر کام اس کے مشورے کے مطابق کرتے ہیں حتیٰ کہ گھر میں کھانا تک پکانے میں اس کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے، لیکن ایک بے چینی سی اور بے سکونی کی حالت اس پر طاری ہو جاتی۔ اس کے خوابوں کی تکمیل تقریباً ہو گئی تھی۔ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائیوں کو روشن مستقبل کی طرف ماحزن کر دیا تھا، پرسکون اور پر آسائش زندگی گزارنے کے لوازمات فراہم کر دیے تھے مگر خود تنہائی کے حصار میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔ زندگی نے اس سے اپنا خراج وصول کر لیا تھا وقت اپنی قیمت لے چکا تھا۔ اسے تنہائی اور بے سکونی میں جکڑا کر دیا تھا اور پھر وہ بری طرح کام میں مصروف ہو جاتا اور خود سے بے باک لگتی اسے قدرے پرسکون کر دیتی۔ اب وہ اپنی تنہائی سے قدرے مانوس ہو گیا تھا اور زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلتی تھی اچانک اس کی زندگی اک نیا روپ لے کر اس کے سامنے گئی۔

”سمیل بھائی! میں نے ایک زبردست فیصلہ کیا ہے کیونکہ آپ ہی نے اس کی اجازت دی تھی اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ میں نے ایک کنواری اڈیز عمر خاتون سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بہت دولت مند ہے اور اس کا سارا بھروسہ شادی کے بعد میرا ہوگا۔“

”کون ہے وہ؟“ سیمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ اس کی خواہش ہے کہ نکاح سادگی سے ہوگا۔ آج شام ہمارا نکاح ہے۔ کل میں اس سے آپ کو طوا دوں گا لیکن بہر حال اس کی تصویر میرے پاس ہے یہ دیکھیں۔“

سمیل نے ٹیک لگا کر تصویر پر لاؤڈ اڈا لی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ شہید بنی تھی۔ تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے رہ گئی۔ اس کے تصور میں

بھی نہیں تھا کہ ثمنینہ اس کے سامنے یوں آ جائے گی۔ اذیت کی ایک لہر اس کے وجود میں دروین کر پھیل گئی۔ اس نے تصور منصور کو واپس کر دی۔ وہ تو چلا گیا لیکن سہیل نے یہ محسوس کیا کہ اس کی زندگی میں دور تک اندھیرا پھیل گیا ہے۔ اب تنہائی کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل اذیت بھی اس کی ہم سفر ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے مسافر صدیوں کی مسافت کے بعد اچانک منزل سامنے آنے پر بے دست و پا اور مجبور ہو جائے، چلنے کی سکت اور قوت گویائی تک چھین جائے۔ وہ ابلہ پائی میں دکھ کا صحرا عبور تو کر رہی رہا تھا۔ شدت کی پیاس ہوتے ہوئے بھی اس نے لیوں کو تر نہیں کیا تھا۔ مگر اب یہ اذیت بھی سہنا مقدر بن گئی کہ نعلستان سامنے ہو لیکن کسی اور سرحد میں جو ممنوعہ ترین علاقہ ہو۔ "نہیں۔ منصور کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اب وہ اپنے دامن میں اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ ایک اور اذیت بھری صلیب کا بوجھ خود پہ لادے۔ منصور کو روکنا ہوگا۔" مگر وہ مثنیٰ انداز سے اٹھا اور باہر کی سمت گیا۔ منصور کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔ منصور حیران سا اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر جلدی سے اس کے قریب آ پہنچا۔

"سہیل بھائی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں میری طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن تم۔ تم ثمنینہ سے شادی نہیں کر سکتے۔" اس نے پھولی ہوئی سانس کے دوران کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس سے ضرور شادی۔۔۔۔۔ مگر آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"بس میں نے کبہ دیا ہے کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔"

"نہیں بھائی میں اس سے شادی سے کسی طرح بھی نہیں رُک سکتا۔ آپ نے شادی نہ کر کے اپنے خوابوں کی تکمیل چاہی ہے لیکن میں نے شادی کٹ مارا ہے۔ آپ نے شادی نہیں کی یہ آپ کا فیصلہ تھا۔ میں شادی کر رہا ہوں یہ میرا حق ہے۔" منصور نے سر جھکا کر کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھائی سے نگاہ نہیں ملاتا رہا تھا۔ "چلو پھر ٹھیک ہے۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔" اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے سہیل بھائی۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے دولت کی طلب تھی، اور ہے مگر میں آپ کی طرح اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔۔۔۔۔ پلیز آپ۔" آگے اس نے کچھ بھی نہ کہا اور سر جھکائے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے لمحے ہی وہ بل کھاتی سڑک پر جا رہا تھا۔

وہ دل سے اٹھتے ہوئے درد کو محسوس کرتے ہوئے وہیں ستون کے ساتھ ٹک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ سواکی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ سچی رضا کی بیوی باہر آئی اور اسے یوں بے دم سا دیکھ کر سہارا دے کر کرسی پر بٹھانے لگی۔ وہ مسلسل پوچھتے جا رہی تھی کہ کیا ہوا جو یوں آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ جب اس نے ثمنینہ سے تعلق کو چھپاتے ہوئے بتایا کہ منصور کیا کرنے جا رہا ہے۔

"ہاں سہیل بھائی۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا وہ اس کمپنی کی مالک ہے جس میں منصور کام کرتا ہے۔"

اس کا پتہ پاتے ہی سہیل جلدی سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف گیا سائینڈ ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور پھر تیز رفتاری سے ثمنینہ کے گھر جا پہنچا۔ وہ جب ثمنینہ کے ہاں پہنچا تو وہ ڈرائنگ روم میں تباہی مچ گئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر سہیل پر پڑی وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پہچان کے سارے رنگ اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

"ثمنینہ! وہ دھیرے سے بولا۔ "کیسی ہو؟"

"کیسی ہو سکتی ہوں تمہارے خیال میں۔" ثمنینہ نے ہاتھوں میں پہنی چوڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح جس طرح میں ہوں۔ کچھ کہہ رہا ہوں میں؟“ ”شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً تم بھی اب تک ایسے کرب میں مبتلا رہی ہو جس میں میں رہا ہوں اور یہی میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ جو تم کرنے جا رہی ہو..... اس سے تمہیں تو قدرے سکون مل جائے گا مگر میرے کرب میں دو گنا اضافہ ہو جائے گا۔ پلیز منصور سے شادی کا خیال ترک کر دو۔ وہ میرا بھائی ہے چھوٹا۔“ تب ثمنینہ زور سے ہنس دی۔ جیسے جیسے وہ یکدم رکی اور کہنے لگی۔ ”منصور نے جو کہا وہ پورا کر دیا۔ سبیل اس نے تمہاری تصویر نبھانے میرے کمرے میں کیسے دیکھ لی تھی اور مجھ سے اس کی بابت پوچھا، میں نے اسے غلط سلط بتایا لیکن آخر اس نے مجھ سے یہ پوچھ کر کے میں نے کس یونیورسٹی اور کس سیکشن میں پڑھا ہے حقیقت اگلوادی۔ میں زندگی سے سمجھو کہ کتنی تھی مردہ مجھے شادی پر مجبور کرنے لگا۔ آخر میں اس کی بات پر راضی ہو گئی کہ اب بھی یہ فیصل مجھے چاہتا ہو تو میں شادی کر لوں گی اور اس نے تمہارا امتحان لینے کی خاطر یہ سارا ڈرامہ چلایا۔“

”کیا.....؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ منصور..... اوہ منصور..... دوسرے کچھ کر بیٹہ نہ کیا۔“

”مگر تم..... بھی.....“ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں بھی..... میں بھی اب تک تم سے محبت کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ثمنینہ کی آنکھوں میں آنسو بہا رہے تھے۔

”نہیں..... اب نہیں رونا۔ اب ہم مل جائیں گے۔ ہم شادی کریں گے، دھوم دھام سے۔“ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ ”دو..... دو یوزھوں کی شادی دھوم دھام سے۔“

”تم جیسے ہوئے اب بھی اتنی ہی حسین لگتی ہو جتنی یونیورسٹی کے دنوں میں لگتی تھی۔“ پھر رک کر بولا۔ ”میں نے تو اپنے مستقبل کو بہترین بنانے کی خاطر جو کچھ لیا تھا مگر تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

”تو ثمنینہ نے آہستہ سے کہا ”پھر وقار کیسے کہلاتی میرا مان مہری وقای تو تھی۔ یہ میری وفا کی چسیا ہی تھی کہ آج تم میرے سامنے ہو۔“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

اور سبیل اس وقاداری کی دیوی کو احرام کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ سنا ہی تھا کہ عورت وقا کا دوسرا نام ہے اور آج وہ اس عورت کو دیکھ بھی رہا تھا پھر خاموشی کے کتنے ہی طویل لمحے گزر گئے اور اچانک منصور کی آواز نے گہری خاموشی کو توڑ دیا۔

”آئیے مولانا صاحب! ایک مولانا آگے بڑھے اور پھر ان کے پیچھے ہی سب گھر والے آگئے۔ سبکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ سبیل کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”ڈرامہ تو میں نے رچا لیا بھائی! اب اس کا ڈرامہ سین مولوی صاحب کریں گے، لیکن اس سے پہلے دونوں بھائیوں کو یہ حکم جاری کیا جاتا ہے کہ وہ بھائی ثمنینہ کو جلدی جلدی تیار کریں۔ نکاح آج شام ہوگا اور کل شام دھوم دھام سے دعوت دلیمر ہوگا۔ جس کی اطلاع میں فون پر سب طے والوں کو دے دوں گا۔“ اس کی تقریر پر ایک زوردار تہقہبہ پڑا۔ وہ سب ثمنینہ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ثمنینہ نے غصے سے کہا کہ وہ وقت کو مات دے کر سرخرو ہو گئی ہے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بابا گنتی؟

تاجہ نگاہ سنہری ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ سہ پہر کی طلائی دھوپ میں ریت کا سمندر بڑا پر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔ اُفتی تک بھوری ریت تھی۔ جہاں سے گہرا نیلا آسمان شروع ہو جاتا تھا۔ درمیان میں کہیں سبز نہیں تھا۔ پر ہول سناتے میں ہوا شور مچاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس قدر جہاک ویرانی تھی کہ دھشت ہو رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ ان دنوں بہار کا موسم تھا۔ گرمیاں اگر ہوتیں، تو یہاں رہنا اک عذاب سے کم نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کے لٹا ہوں اُس طرف پھیر لیں، جہاں کنیشنروں اور کیوئوس کی چھو لہاریوں سے ایک ہستی اُگ آئی تھی۔ تب بے اختیار میرے سنے میں گنتی ہوئی سانس یوں آزاد ہوئی جیسے کبوتر کو ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔ میں اُدھر چل دیا۔

ہم ایک غیر ملکی کپتی کے تحت اس صحرائی علاقے میں گئے تھے۔ وہاں جا کر یوں لگا جیسے ہم پوری دنیا سے کٹ گئے ہیں۔ ہم نے جہاں کیپ لگا یا تھا وہ ٹیلوں میں گہری ہوئی قدرے صاف زمین تھی۔ قریب ہی ایک کچی سڑک تھی۔ جوشال میں تقریباً پائیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ تک لے جاتی تھی۔ ہفتہ وار چھنی کے دن ہی ہم کپتی کی گاڑی میں اس قصبے تک جاتے۔ تب ہمیں یقین ہوتا کہ ہم بھی اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں ایک اکلوتا پانی ہی اوتا تھا۔ جہاں سے بڑی کوشش کے بعد ہم اپنے گھر والوں سے رابطہ کر پاتے تھے۔ ہمارے کیپ کے جنوب میں ایک چھوٹی سی مقامی لوگوں کی بستی تھی۔ اس بے آب و گیاہ صحرا میں یہ کچی بستی غنیمت تھی۔ ہمارے وہاں ہونے سے انہیں بڑا معاشی فائدہ ہوا تھا۔ وہاں کے نوجوان ہمارے ساتھ کام میں شامل ہو گئے تھے۔ جس سے ان کی اچھی مزدوری بن جاتی۔ ہماری بھی کھانے پینے کی کافی ضروریات وہیں سے پوری ہونے لگیں۔ خصوصاً وہاں کا خالص دودھ ہمیں میسر آنے لگا۔ وہ نوجوان صبح صبح آ جاتے، سارا دن کام کرتے اور شام کو اپنی بستی پلٹ جاتے۔ چند دنوں میں ان سے خاصی مانوسیت ہو گئی۔

میری وہاں پر ایک سپروائزر کی حیثیت سے نوکری تھی۔ میرے ماتحت مقامی مزدوروں سمیت چندرہ سے ہیں افراد کام کرتے تھے۔ پہلے پہلے میرے لئے وہاں کام کے علاوہ بوریٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر چند دنوں کے بعد ہی ان مقامی مزدوروں کی وجہ سے یہ کیفیت نہ رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان میرے ساتھ کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ میں بھی ان میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ میری دلچسپی کی وجہ ان کی آپس کی گفتگو تھی۔ وہ اکثر کسی بابے گئی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ جیسے ہی بابے گئی کا ذکر آتا یا اس حوالے سے کوئی بات کرتا تب وہ کھلکھلا کر ہنس دیتے۔ بابا گئی کے حوالے سے بات کر کے وہ بہت مزہ لیتے۔ مجھے تجسس ہونے لگا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ بابا گئی کون ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے؟ کیا انہوں نے کسی اشارے کے لئے کوئی اصطلاح گھڑی ہوئی ہے، یا واقعتاً کسی بابے کا کوئی وجود ہے؟ دن بدن میرے لئے تجسس بڑھتا گیا۔ آخر ایک دن جب آرام کا وقت تھا اور سب آرام کر رہے۔ میں نے ان مقامی مزدوروں میں سے زیادہ سمجھ دار لڑکے سانول کو بلا لیا۔ وہ مجھ تکے ہوئے میرے

خیمے میں آگیا۔ میں نے اسے سوڑے کی ٹھنڈی بوتل پیئے کوئی۔ پھر اس سے مقامی بودوباش وغیرہ کے بارے میں کپ شپ کرنے لگا۔ اس دوران میں نے بابے مگی کے بارے میں پوچھ لیا۔ پہلے تو اس نے شرمندگی سے میری جانب دیکھا پھر کھسیانی سی ہنسی میں بولا۔

”اوسائیں اس کا کیا ذکر کرنا۔“

”پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے اصرار کیا۔

”کیا کریں گے اس کے بارے میں پوچھ کے۔۔۔ انویں بس۔۔۔“ وہ اس ذکر سے چٹا چاہتا تھا۔ اب جبکہ میں نے ہاتھ چھیڑ لی تھی۔ اس لئے تھوڑی بہت معلومات تو لے لیتا چاہتا تھا۔

”یار، جیسا بھی ذکر ہے، تم بتاؤ،“ میں ذرا سے سخت لہجے میں کہا تو وہ بولا

”سائیں! ہماری ہستی میں ایک بوڑھا بابا رہتا ہے۔ اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔“

”مگر جب بھی تم لوگ اس کا ذکر کرتے ہو تو۔۔۔“

”وہ ایسا ہے! سائیں کہ وہ باتیں بڑی عجیب عجیب سی کرتا رہتا ہے۔ جس کہ نہ اسے سمجھ آتی ہے اور نہ ہمیں۔“

”نہ اسے سمجھ آتی ہے نہ تم لوگوں کو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟“ میں دہی دہی حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایسی باتیں کرتا ہے، جس کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر“ اس نے ہولے سے بتایا۔

”وہ کوئی ذہنی مریض ہے؟“ میں نے کرید

”نہیں نہیں سائیں! کبھی کبھی تو وہ بڑی سیانی باتیں کرتا ہے۔ اصل میں وہ بولتا ہی کم ہے۔ پھر جب باتیں کرتا ہے تو سیانی باتیں کرتے کرتے اچانک مڑی سے اتر جاتا ہے۔ وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔“ اس نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مطلب وہ کیسی باتیں کرتا ہے؟“ میں نے الجھتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا تو وہ چند لمبے میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا

”کیا بتاؤں سائیں! کوئی کام کی بات ہو تو کہوں۔“ اس نے پھر سے پہلو تہی کرنا چاہی۔ مگر میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس لئے کہا

”میں نے دیکھا ہے تم لوگ اکثر اس کا نام لے کر ہنستے رہتے ہو۔ کوئی خاص وجہ ہوگی تبھی تم لوگ۔۔۔“

”سائیں بات یہ ہے وہ ایسی بڑھنگی اور فضول بات کرتا ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ سب اسے بابا مگی ہی کہتے ہیں۔ لیکن جو بات وہ کرتا ہے، وہ کپ بھی نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کیا کہتا رہتا ہے۔“ اس نے بے حذر دہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا وہ جیسی بھی بات کرتا، اسے چھوڑ دو۔ تم مجھے اس کی کوئی ایک بات بتاؤ۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ تو وہ خیالوں میں کھو گیا جیسے کوئی بات منتخب کر رہا ہو۔ پھر بولا

”اس کی ایک بات بتاتا ہوں سائیں۔ ایک دفعہ محل کے شکار کی بات محل نکلے۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے کبھی زندگی میں محل کا شکار نہیں کیا ہوگا۔ ہر کوئی اپنا اپنا قصہ یا واقعہ سناتا رہا۔ جس میں کچھ عجیب تھا کچھ جھوٹ تھا۔ ہر کوئی اپنی باری پر بات کرتا رہا۔ جب بابے کی باری

آئی اس تو کمال کر دیا۔" دو سانس لینے کے لئے زکا اور پھر کہتا چلا گیا "کہنے لگا ہم لوگوں نے کیا شکار کیا ہوگا۔ شکار تو میں نے کیا تھا۔ میں دریا کے پل پر کنڈی لگا بیٹھا تھا۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہ ہوا تھا کہ ایک مچھلی میری کنڈی میں لگ گئی۔ میں نے اسے باہر نکالنا چاہا تو وہ نہ نکلی۔ آخر میں ڈور پل کے ساتھ ہانہ می اور خود دریا میں چھلانگ لگا دی۔ تاکہ دیکھوں تو کسی معاملہ کیا ہے؟ میں نے نیچے پانی میں جا کر دیکھا تو مچھلی کم از کم چالیس فٹ کی تھی۔" اتنا کہہ کر سائل رک گیا۔

"اچھا پھر۔۔؟" میں نے تیزی سے پوچھا

"سائیں۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ کہنے لگا۔۔۔ میں نے اس مچھلی کو دریا سے باہر نکالنا چاہا مگر وہ نہ نکلی۔ میں دریا سے باہر گیا۔ قریب ہی کنارے پر ملاحوں کی کشتیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کشتی اور چند غوطہ خور مزدور لئے۔ دریا میں اس جگہ آیا تو مچھلی کا ٹکڑا لے لئے میں ابھی ہوئی تھی۔ میں نے مزدوروں کی مدد سے اس مچھلی کو کشتی میں لا کر کنارے پر لے آیا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر زک گیا تو میں نے کہا "پھر۔۔۔ ا"

"پھر کہنے لگا کہ اتنی بڑی مچھلی دیکھ کر لوگ کافی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس مچھلی کو گھر کیسے لے کر آؤں۔ میں نے وہ اسے وہیں بانٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی اس کا پیٹ چاک کیا گیا، اس میں ہی ایک زمرہ بلی نکلی۔ میں نے اس بکڑا چاہا مگر وہ چھلانگ لگا کر بھاگ نکلی۔ بس میں نے وہ مچھلی وہیں بانٹی اور گھر آ گیا۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے یوں اطمینان بھرا سانس لیا جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

"ہائیں ایہ کیا بات ہوئی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں خود حیران رہ گیا تھا۔ یہ تو خوابوں کی اصطلاحوں اور اشاروں جیسی باتیں تھیں۔ جس کی نہ کوئی منطق، نہ کوئی دلیل، نہ وجہ اور نہ کوئی جواز تھا۔

"وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" وہ جھپٹے ہوئے بولا

اس دن کے بعد سے میرا تجسس کم ہونے کی بجائے مزید بڑھ گیا۔ وہی ایک بات میرے ذہن میں گھومتی رہی۔ اس پر میں سوچتا بھی چاہتا تو کوئی ایسا سرا میرے ہاتھ نہ لگتا کہ جس کے سہارے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکتا۔ ان مقامی نوجوانوں میں ایک نوجوان چند ڈانامی بھی تھا۔ ایسے ہی ایک دن وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ یونہی گپ شپ کے دوران ہابا گپی کا ذکر آ گیا۔

"یار چندو ڈا! اس کی کوئی گپ سناؤ۔" میں نے تجسس سے کہا۔

"گپ۔۔۔! گھڑکھو سائیں۔ خیر میں ایک سنا تا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ لمبے خاموش رہا پھر بولا "ہابا گپی کو اس علاقے میں آئے کوئی پانچ چھ سال ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ شروع سے یہاں نہیں رہتا۔ میرا مطلب وہ مقامی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا

"نہیں! بزرگ کہتے ہیں کہ سانپ، شیر اور درویش کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اب وہ پتہ نہیں کیا ہے۔ نجانے وہ کہاں سے آیا ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے بستی کے باہر وہ چھپر ڈال کر اس میں رہتا ہے۔ کسی نے کچھ کھانے کو دے دیا تو کھا لیا ورنہ یونہی پھرتا رہتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں

انگن۔ اس کے چھپر کے سامنے ایک بڑا سادہ رخت ہے۔ جس کی بڑی گھٹی چھاؤں ہے۔ بوڑھے اور قارغ لوگ اکثر وہیں جا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ چاہے وہاں ہونہ ہو۔ کبھی کبھار ہمارا دل کرتا ہے کہیں سننے کو تو ہم بھی چلے جاتے ہیں۔ کبھی اس نے ذکر نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ پر اس کے آنے سی ہستی میں روتی بہت ہے۔ اس نے ابھی خاصی معلومات دے دی۔

”وہ تم اس کی کوئی گپ سنانے لگے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا

”ہاں۔! ایک دن کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بات اسی صحرائی علاقے کی سیاحت ہارے چل نکل، جہاں ہم آباد ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ عمریں گزر جاتی ہے اس کو پورا دیکھنے کے لئے۔ تب بابا گئی نے بڑے احساں سے بتایا کہ وہ ستر سال پہلے اس پورے علاقے کی سیر کر چکا ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہیں بیٹھے ایک بوڑھے نے کہا کہ چند دن پہلے تم نے اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے۔ کیا تم پیدا ہونے سے پہلے ہی اس علاقے کی سیر کر چکے ہو؟“

”پھر اس نے کیا جواب دیا؟“ میں نے دیکھی سے پوچھا

”غیر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا لیکن بڑی ہی عجیب گئی سے بولا کہ جس کا جو جی چاہے مجھ سے پوچھ لے۔ میں بتا دیتا ہوں کہ کہاں پر کیا ہے۔“ اس نے مزہ لے کر بتایا

”پھر پوچھا تم لوگوں نے۔۔۔؟“ میں نے جلدی سے پوچھا

”نہیں۔! اس کی بات کو یونہی گپ سمجھ کر ہوا میں اڑا دیا۔“ وہ بولا۔

”اوہ۔!“ میں نے ایک خیال کے تحت بڑے افسوس سے کہا۔ پھر کچھ دیر تک بات کرتے رہنے کے بعد ہم اپنے کام کے لئے اٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ چند وا اپنے ساتھی سانول سے زیادہ باتونی اور صاف گو ہے۔

میرے ذہن میں بابا گئی کے بارے میں مزید تجسس در آیا۔ آخر وہ کیا آدمی ہے۔ میں اکثر اس کے بارے میں یونہی سوچتا رہتا۔ اور میرے ذہن میں اوت پٹانگ باتیں گھومتی رہتیں۔ ایسے ہی ایک دن چند وا سے مجھے نہ صرف بابا گئی کے بارے میں تازہ گپ سننے کو ملی بلکہ نئی معلومات بھی ملی۔

”سائیں، آج میں آپ کو ایک تازہ گپ سنا تا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی بوتل کو خافت پی کر خالی کرتے ہوئے ایک طرف رکھ کر کہا۔

”بولو۔!“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”بابا گئی کے پاس یونہی گپ شپ کے دوران پالتو جانوروں کی بات ہونے لگی۔ ہر کسی نے اپنی بات کی۔ جب بابے کی باری آئی تو پتہ چس نے کیا کہا؟“ اس نے بات کرتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولا

”تم ہی بتاؤ۔“ میں نے کہا

”کہنے لگا، میرے پاس ایک ایسی نسل کا کتا تھا، جو رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کا قد گائے کے چھڑے جتنا تھا۔ وہ میں

نے رکھائی کے لئے نہیں بلکہ لڑائی کے لئے رکھا تھا۔ وہ تین سال تک زندہ رہا۔ اس دوران اس نے کوئی مقابلہ نہیں ہارا۔

”یار چندو! یہ تو عام سی باتیں ہیں۔ اس میں کوئی گپ والی بات تو نہیں۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں سائیں۔! میں جو کہنے والا ہوں وہ تو سنیں نا۔“ اس کے لہجے میں اک ذرا احتجاج چمک پڑا۔ میں خاموش رہا تو وہ کچھ جھلا

گیا: ”کتوں میں جتنی اچھی خصوصیات ہوتی ہیں وہ ساری اس میں تھیں گپ والی بات یہ ہے کہ بھول بابا گئی کے، وہ کتا انسانوں کی طرح بولتا تھا۔“

اس نے اپنی بات تیزی سے مکمل کر کے گہری سانس لی اور پھر میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اپنی بات کا رد عمل جانا چاہتا ہو۔ اب میں اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔

اس دن جو دوسری بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اسے پنجاب کے ایک شہر ساہیوال سے بہت اُنسیت تھی۔ بابے کے مطابق اس شہر کی ہر شے اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ ساہیوال سے اس کی جذباتی قسم کی محبت تھی۔ جیسے لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے جن کتوں سے معشوق پانی بہرتے ہیں وہ بیٹھے ہیں باقی سب کھارے ہیں۔ اس طرح جس شے کے ساتھ ساہیوال کا نام جڑا ہے۔ وہ سب سے اچھی ہے۔ جگہ بابا گئی نے اگر کبھی اپنی سائیکل ٹھیک کروائی تھی تو ساہیوال سے۔ اس کے جیسے کارنگر کہیں نہیں پائے جاتے۔ بھول بابا گئی ”میں سائیکل لے کر نکلتا ہوں میں کاسٹر کے، سائیکل مرمت کروا کے، شام کو واپس آ جاتا۔“

چند مدتوں کے بعد میں نے بھی وہی طور پر مان لیا کہ وہ اگر دنیا کا سب سے بڑا گپ باز نہیں ہے تو کم از کم اس صحرائی علاقے کا سب سے بڑا گپی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایک بات اور بھی محسوس کی۔ وہ مقامی نوجوان آپس میں مذاق کرتے ہوئے بابا گپی کا نام لیتے اور قہقہہ لگا کر ہنس دیتے۔ انہی لمحات میں مجھے خیال آتا کہ یہ کہیں دوسروں کو بے وقوف تو نہیں مانتے؟ اور ان کا پہلا نشانہ میں ہوں۔ ممکن ہے بابا گپی کا وجود ہی نہ ہو، کوئی فرضی کردار مگر رکھا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہوں نے کسی خاص اشارے یا استعارے کے لئے بابا گپی کی اصطلاح وضع کی ہوئی ہو۔ جب میرے دل میں اس بابے سی طے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک تو متعجب یہ تھا کہ اس کی وجود کی تصدیق ہو جائے، دوسرا یہ بھی تھا کہ دیکھوں تو سکی کیا واقعہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے، جس طرح سانول اور چندو! وغیرہ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ لیکن وقت تھا کہ ملتا ہی نہیں تھا۔ شام کو تھکن سے بدن چور ہو رہا ہوتا تھا۔ اس وقت تو بس آرام کرنے کی سوجھتی تھی۔ یا پھر چھٹی

کے دن نزدیکی قصبے میں جانا ہوتا تھا تا کہ اپنی گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کر لی جائے۔ وہاں بھی خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ یوں باوجود خواہش کے میں بابا گپی کو دیکھنے اور اس سے ملنے نہ جاسکا۔

اس صحرائی علاقے میں ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے پانچ ہفتے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ ایک دن اچانک ہیڈ کوارٹر سے مجھ سمیت چند آدمیوں کو واپس بلوالیا گیا۔ وہ ہمیں کسی اور پراجیکٹ کے لئے بھیجا جاتے تھے۔ ہماری جگہ کام کرنے کے لئے جو لوگ، جس گاڑی میں آئے تھے۔ ہمیں اسی پر واپس جانا تھا۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی فوری طور پر جانے کیلئے تیاری کر لی۔ میرے پاس ایک بیگ تھا اور بس۔ جس وقت ہم وہاں سے چلے تو دو پہر ڈھل کر سورہ پہر سے مل رہی تھی۔ تب اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ میں بابے گپی سے تو ملتا ہی نہیں

ہوں۔ اس سے ملنے کے لئے میرے دل میں بڑی ہمدت سے خواہش ابھری۔ مگر اتنے مختصر وقت میں کیسے مل سکتا ہوں۔ اگر اس کی ہستی راہ میں ہوتی تو کچھ دیر رک جاتے۔ تاہم میں نے ایک کوشش کرنے کی ٹھان لی۔

گاڑی کے ڈرائیور کا نام عرفان تھا۔ وہ میرا اچھا خاصا سنا سنا تھا۔ میں نے اس سی بات کی۔ وہ اس شرط پر مان گیا کہ باقی لوگوں کے تیار ہو جانے تک ہم وہیں آ جائیں گے۔ میں نے اسے گاڑی لانے کو کہا اور خود ان مقامی نوجوانوں کے پاس چلا گیا۔

”سائیں، آپ اس وقت یہاں کیسے؟“ جھدوڈا نے پوچھا۔ انہیں ہمارے جانے کی خبر ہوئی تھی۔

”میں اس وقت تمہاری اس بات سے ملنے جا رہا ہوں۔“ میں نے پر سکون انداز میں کہا تو وہ حیرت اور تذبذب میں یوں

”چھ نہیں۔۔۔ چھ نہیں سائیں وہ ملنا بھی ہے یا نہیں اس وقت۔۔۔“

اس کے یوں کہنے پر میرا شک یقین میں بدلنے لگا کہ یہ لوگ اب تک جھوٹ بولتے آئے ہیں۔
 ”چلیں دیکھتے ہیں، ہل گیا تو ٹھیک، ورنہ میری قسمت“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
 ”جل سائل۔۔۔ تو انہیں لے جا“
 ”نہیں یا تو لے جا“ چندو ڈاتے جلدی سے کہا
 ”ہم سب چلتے ہیں۔“ میں نے یہ کہہ کر ان کی مشکل حل کر دی۔

کچھ لمحوں میں وہاں گاڑی آگئی۔ ہم اس میں سوار ہوئے اور بستی کی جانب چل دیئے۔ دوران سفر وہ سب خاموش تھے۔ اس وقت وہ صحرا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نجانے اتنے دن یہاں رہنے کی وجہ سے قربت کا احساس ہو گیا تھا۔ ہمارے سفر کا اختتام ایک جمو نیڑی کے پاس ہو، جسے مقامی زبان میں ”کوپا“ کہتے ہیں۔ وہاں باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ اور محنت تھا۔ جس کے اس پاس کافی ساری زمین ایسے صاف تھی،، جیسے ابھی کسی نے وہاں آکر بیٹھنا ہو۔ ایک طرف صف لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس کی پاس ہی دو گھڑے، جن پٹ سن کی بوری کے ٹکڑے لپیٹے ہوئے تھے تاکہ بانی ٹھنڈا رہے۔ ہم وہاں جا کر روک گئے۔

"پتہ نہیں رہا اندر ہے بھی کہ نہیں۔۔۔ کہانا کہ وہ سیلابی بندہ ہے۔" جتوڑا نے تشویش سے کہا۔

"تو آواز تو دے۔" سانول نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر زور سے آواز دے دی۔ "ہا ہا ہوٹے۔۔۔!"

دوسری آواز پر ایک شخص جھونپڑی میں سے نمودار ہوا۔ پہلی ٹاڈ میں وہ کوئی خاص تاثر نہیں دے سکا۔ چھوٹے سے قد کا کالا بھنگ سا شخص تھا۔ سر سے آدھا گنجا، سفید بال یوں الگ سے دکھائی دے رہے تھے جیسے گوند سے چپکائے گئے ہوں۔ اسی طرح چھوٹی سی بے ترتیب ڈاڑھی اور ہماری موٹھیں جو اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ان گھنی موٹھوں کے درمیان سے جھانکتے موٹے موٹے سیاہ ہونٹ عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔ جینس ہاک آگے سے ذرا سی مڑی ہوئی تھی۔ اس کی کٹنی آنکھوں میں بلا کی جھک تھی۔ یوں جیسے چھتے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ چہرے اور سر کی نسبت کان بڑے تھے۔ اس نے سفید براتی دھوتی

اور کرتا پھرتا ہوا تھا۔ پاؤں میں چڑے کا جوتا پہنے ہوئے تھا جس کا رنگ اڑچکا تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی سری لنگن لگا تھا۔ کرکٹر جے سورا سے اس کی بہت حد تک مشابہت تھی۔ اس لئے وہ مجھے سری لنگن لگا تھا۔ یا پھر ایسا بنگالی جس نے دریا کے علاوہ زمین ہی نہ دیکھی ہو۔

”ہا ہا ہا۔۔۔ یہ تم سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔“ جندوڑے نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ تب اس نے پہلے مجھے سرتاپا غور سے دیکھا اور پھر وہ اپنے قدم سے زیادہ بھاری آواز میں بولا

”کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

بلاشبہ میرے پاس جو موقع جواب تھا وہ میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں اس کوئی مصلحت آمیز جواب دینا چاہتا تھا کہ سانول جلدی سے بولا

”دوسرے تم سے کیوں ملنے آتے ہیں۔ کبھی کسی چنگے بندے کی بھی بل لیا کر۔“ اس کا لہجہ کافی حد تک جھک آمیز تھا۔ جسے میں نے تو مسموس کیا مگر باپے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بابا شاہ مسکرایا تھا۔ بڑے خوشنوار لہجے میں بولا۔

”آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ بیٹھو۔ یہ کہہ کر وہ صف بچھانے لگا۔

”ہم نے اتنی دیر نہیں بیٹھنا، بس چند منٹ۔۔۔ میں نے کہا

”اُوجھاب بیٹھو۔“ اس بار اس نے بڑی لہر میں کہا تو میں صف پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے پوچھا، ”باتیں تو ہوتی رہیں گئیں، سنا میں کیا

سیوا کروں کیا کھائیں چکیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے پہلے سے سوچا ہوئی بات کہہ دی۔

”آپ شاید ہماری سیوا نہ کر سکیں اس لئے تھوڑی دیر۔۔۔“

”آپ حکم تو کریں۔۔۔“ اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا

”تو پھر آپ ہمیں ساحوال میں موجود چاچے فضل دین طوائی کے لڈو کھلا دیں۔“ میں نے کہا تو باپے نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر بڑے سمبیر انداز میں بولا

”اچھا، چل وہی کھلا دیتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور گوپے کے اندر چلا گیا۔ اس پر وہ مقامی نوجوان کھیانی ہٹی میں چپنے لگے اور سرگوشیوں میں نجانے کیا کچھ کہتے رہے۔ وہ چونکہ ذرا فاصلے پر کھڑے تھے۔ اس لئے ان کی کوئی بات میرے تپے نہیں پڑی تھی۔ میں نے ہابے کو گوپے کے اندر گئے جب دس بارہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تو سانول کھیانی ہٹی چپتے ہوئے بولا

”سائیں چلیں؟“

”ابھی ٹھہرو، بابا اندر گیا ہے اسے واپس آ لینے دو پھر چلتے ہیں۔“ میں تذبذب سے کہا

”اس نے اب کیا باہر آتا ہے۔ آپ نے فرمائش ہی ایسی کر دی ہے۔“ جندوڑا نے دھیرے سے کہا

”چلو دو منٹ اور دیکھتے ہیں پھر واپس چلتے ہیں۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں کہا اور گوپے کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مجھے انفسوس

ہونے لگا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ایسی فرمائش کر دی۔ اتنی دیر میں اس سے ہاتس کر کے کچھ تھوڑا بہت خود اندازہ لگا لیتا کہ وہ کسی ہاتس کرتا ہے۔ بہر حال چند منٹ بعد میں مایوس ہو کر وہاں سے جانے کے لئے اٹھ گیا۔ اس وقت میں صف سے اٹھ کر جوتی پہن چکا تھا جب ہاگوپے میں سے نمودار ہوا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس کے ہاتھ میں نے چاہے لٹھل دیں طوائف کی دوکان کی مخصوص چھاپ والا گتے کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں دیکھا۔

”معاف کرنا جوان۔ اچھے دیر ہو گئی۔ دوکان پر تورش نہیں تھا، مگر اس بازار میں لڑائی ہو گئی تھی۔ ایک بندہ جہاز فنی ہو گیا۔ بس ان کی لڑائی ختم کراتے دیر ہو گئی۔ آؤ بیٹھو۔۔۔ کھاؤ۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میرے ساتھ وہ مقامی نو جوان بھی چٹنی چٹنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، جب اس نے ڈبے کا ڈھکن اتارا اور اس میں سے تازہ ورق لگے لڈو دکھائی دیئے۔

”جی۔۔۔!“ میں سمجھتے ہوئے بیٹھ گیا تو میرے ساتھ وہ نو جوان بھی بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک ایک لڈو ڈالنا شروع کیا۔ جبکہ بابا کبر ہاتھ۔ ”یہ آج ہی تازہ لڈو دہنے ہیں۔ مجھے خود بہت پسند ہیں۔ اور پھر سا میوال تو سا میوال ہے اس کی تو ہر شے اعلیٰ ہے۔“

”کیوں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو چند لمحے میرے بچاؤ دیکھتا رہا پھر بڑے جذب سے بولا

”یہ تمہیں اس وقت پتہ چلے گا جب تم کہیں غائب ہو جاؤ گے۔“

اس وقت میں اس کی بات بالکل نہیں سمجھا تھا لیکن لہجے سے مرعوب ضرور ہوا تھا۔ مجھے جلدی تھی۔ عرفان بار بار گڑھی پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کر رہا تھا۔

”اچھا بابا جی اجازت۔۔۔!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تب وہ بھی کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہولے سے بولا۔

”سنو! مشغروں میں نہیں الجھتے، ان کی روح کو سمجھتے ہیں اس طرح انسان بھی الجھا ہوا ہے۔ جس دن اُسے اپنی سمجھ اٹھ گئی، اسی دن پوری کائنات اس کے تابع ہو جائے گی۔ حالانکہ اسے بتا دیا ہوا ہے کہ یہ کائنات اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور وہاں ہی کے لئے مڑ گیا۔ مقامی نو جوان وہیں رہ گئے تھے

قریبی قصبہ آ جانے تک میں اس بابے کی بات میں کھویا رہا۔ شام ہو جانے کی وجہ سے مغربی افق نارنجی ہو رہا تھا۔ پرندے اپنے لٹکانوں کی جانب رواں تھے۔ میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہاں آتے ہوئے صحرائی منظر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہاں کی ویرانی مجھے ہاتس کرتی محسوس ہونے لگی تھی۔

”یار۔! گھر فون کر کے بتا دیں، پھر چلتے ہیں۔“ میرے ایک ساتھی نے کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ پی پی اے تک چلا گیا۔

ساہیوال میں میرا ایک دوست انور علی رہتا تھا۔ وہ بکلی سے چلنے والی اشیاء کا ملکیت تھا۔ اس کی اسی بازار میں دوکان تھی، جہاں چاہے

فضل دین طوائف کی دوکان تھی۔ میں نے اسے فون کر دیا۔ حال احوال کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”آج تمہارے بازار میں کوئی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جس میں کوئی آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا؟“

”ہاں ہار، یہ دو تین گھنٹے پہلے کا واقعہ ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے اضرائی انداز میں فون بند کر دیا۔ تب سے لے کر اب تک، میرے ذہن میں یہی سوال ہے کہ کیا وہ واقعی تھی تھا؟



قلمکار کلب پاکستان

﴿..... اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟

☆..... آپ اپنی تحریروں ہمیں روانہ کریں ہم ان کی نوک پلک سنوا دیں گے۔

﴿..... آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟

☆..... ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

﴿..... آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

﴿..... آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

تو..... ہم آپ کی ملاجعتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar_club@yahoo.com

حلیف میں رکھی کتاب

وہ کسی اجنبی کی طرح میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور کتاب پر نظر رکھے۔ لیکچر سننے لگی۔ میں محسوس ہی نہ کر سکا کہ وہ کب تک مجھے سب سے منفرد اور اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ نہ تو بلا کی حسین تھی اور نہ ہی ایسی کہ جیسے دیکھتے ہی دل دھڑکنا بھول جائیں۔۔۔ بعض لوگوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ ہزار لوگوں کے اجتماع میں بھی منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ چالیس پینتالیس کی گلاس میں فقط سات لڑکیاں تھیں اور وہ ان میں سے ایک تھی۔ شروع دن سے ہی وہ عام لڑکیوں کی مانند کبھی سبکی اور ڈری ہوئی نہیں تھی۔ چند لڑکے اس کی جانب بڑھے بھی لیکن وہ کسی کے ساتھ بھی نہ ٹھکل سکی اور پھر کسی نے اس کی جانب توجہ ہی نہ دی، اس کی حیثیت حلیف میں رکھی کتاب کی مانند ہو گئی جس کے سرورق کو تو ہر کوئی دیکھتا لیکن کوئی نہیں چاہتا تھا کہ پڑھے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود ہر اک خول تان لیتے ہیں، یہ خول وہ خود اپنے آپ بٹا لیتے ہیں یا ماحول ان پر بن جاتا ہے۔ وہ اس خول کے عادی ہو جاتے ہیں کہ باہر نکلتا پسند ہی نہیں کرتے۔ شاید اس خول کی وجہ اس کے اپنے اندر ہی کا خوف یا کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ جس کو چھپانے کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں۔ مگر اس لڑکی پر کوئی خول نہیں تھا، اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کی یہ خوبی اس طرح عیاں ہوئی کہ دوسری لڑکیاں تو اک وفاقی انداز اختیار کئے ہوئے تھیں، انہیں خوف کھائے جا رہا تھا کہ لڑکے انہیں بچا دکھانے کی فکر میں ہیں۔ مگر اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ کسی موضوع پر اگر بات کرتی تو پھر کرتی ہی چلی جاتی۔ لفظ ایک شفاف ندی کی مانند بہتے، لیکن جب خاموش ہوتی تو جھیل کی مانند لگتی، جس کی گہرائی کا اندازہ مشکل معلوم ہوتا۔ اسے اگر دور سے پہچانا ہو تو اپنی چال سے پہچانی جاسکتی تھی، جسے میں کبھی کوئی نام نہیں دے سکا۔ وہ کبھی برنی کی مانند لگتی اور کبھی سانپ کی طرح تل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس کی ہماری، موٹی اور لانی چوٹی پنڈلم کی طرح بھول کر اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔

پھر تھوڑا وقت گزرا، ایک دوسرے کے بارے میں جان پہچان ہوئی تو تعلق کے سلسلے بننے لگے۔ یوں ہوتا ہے نا کہ بہت سارے لوگ جب ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو ہم انہی کے ساتھ زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں جن میں کچھ قدریں مشترک ہوں۔ یہ چاہے عادات ہوں، گفتگو ہو یا پسند و ناپسند۔۔۔ یوں ایک بڑا گروہ چھوٹے چھوٹے ذیلی گروہوں میں بٹا چلا جاتا ہے۔ اگر قدریں ایک جہتی ہوں تو سب ایک ہی خیال میں پروئے جاتے ہیں۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو بکھری مالا کے موتیوں کی طرح چار دانے وہاں اور دو دانے وہاں اپنی انگ حیثیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح مشترک قدروں کے باعث دوستیاں اور تعلق بننے لگتے ہیں۔ لڑکے اپنے ہاتل کی بنیاد پر یا سیاسی خیالات کی بدولت بکھر کر رہ گئے اور لڑکیاں بھی مخصوص گروہوں میں سمٹ گئیں۔ ایک میں چار، دوسرے میں ایک اور تیسرے میں فقط دو اور یہ لڑکیوں والا گروپ اسی کا تھا۔ ایک وہ خود تھی اور دوسری نعمانہ تھی۔

☆☆☆

قریبی پارک میں کلاس نور جانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی مشورہ دے رہا تھا اور کوئی مشورہ لے رہا تھا۔ لڑکیاں اپنے ذمے کام لے رہی تھیں اور لڑکے اپنے ذمے، ایک جوش تھا اور خوشی تھی۔ پروگرام تقریباً طے تھا اور میرے ذمے کام لگ چکا تو میں وہاں سے اٹھ آیا، اب وہاں سوائے گپ شپ کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں اپنی جائے عالیت کی طرف بڑھا۔ کئیتین ہی اک ایسی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ وہاں چائے، سکریت کے ساتھ پیئنے کو بہترین جگہ تھی۔ کدوں کے گھنے ہوئے ماحول سے باہر کھلے میں جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ، وہاں اپنی مرضی کے خیالوں کی دنیا سجا کر آتے جاتے لوگوں کے چہرے پڑھ کر یا مگر اچھے اچھے لوگوں سے باتیں کرتے وقت گزار لیا جاتا تھا۔ میں کئیتین تک گیا۔ وہاں چائے کا کہہ کر سکریت لیے اور کونے کو طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ مجھے وہ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان کے ایک کونے میں بیٹھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ نعمانہ تھی۔ وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ اسی لمحہ اک احساس، اک خیال درکھول کر ہوا کی طرح ذہن میں آیا کہ کیا انہیں نور سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ سب کے درمیان کیوں نہیں بیٹھیں؟۔۔۔ مجھے معلوم کرنا چاہیے۔۔۔ مگر کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ خود ہی سوچ کر پھر اپنے خیال کی تردید کر کے انہیں ذہن سے نکال کر باہر لان میں اک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ایک دن یورترین لیکچر ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، میں چپکے سے اٹھا اور کلاس روم سے باہر آ گیا۔ استاد جو باتیں بتا رہے تھے وہ میں مٹی طور پر کر چکا تھا۔ ادھر ادھر جانے کی بجائے میں جائے عافیت کی جانب سیدھا گیا، چائے کا کہہ کر مڑا تو سامنے دو دونوں آتی دکھائی دیں۔ قریب آنے پر تقریباً ایک ساتھ ہی دونوں نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا تو نعمانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہم چائے نہیں پیتیں۔۔۔ بس جڈسٹری کے ساتھ بوتل پی لیں گی۔“ مجھے اس کا یہ بے تکلفانہ انداز بہت اچھا لگا۔

”تشریف رکھیں۔“ میں نے آم کے چڑ کے نیچے چھٹی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا تو وہ ادھر چلی گئیں۔ میں آرڈر دے کر ان کے پاس جا بیٹھا تو نعمانہ بولی۔

”آپ بیشتر وقت یہیں گزارتے ہیں۔۔۔ آپ کو پڑھائی سے دلچسپی نہیں؟“

”دلچسپی ہے مگر کلاس میں دل نہیں لگتا۔۔۔ یہاں وقت اچھا گزار جاتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پاس نہیں ہوتا؟“ پہلی مرتبہ بجائے نعمانہ کے سہلی مجھ سے یوں ہلکا مام ہوئی تھی۔

”پتہ نہیں۔۔۔“ میں نے جوابا کہا تو وہ ہنس دی اور بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں یا تو لوگ پڑھنے آتے ہیں یا فائنل انجوائے کرنے۔۔۔ آپ کا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟“

”یہ بھی پتہ نہیں۔۔۔ یا یوں کہہ لیں دونوں ہی یادوں ہی سے نہیں۔۔۔“

”بڑی بھل گفتگو کرتے ہیں آپ۔“ نعمانہ کہنے لگی۔

”ہو سکتا ہے ایسے ہی ہو۔۔۔ مگر جب اور کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو پھر جو کام کیا جائے، میرا خیال ہے اس کی افادیت بندے کی نظر

میں کم ہی ہو جاتی ہے۔ ڈگری کا حصول میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے، علم حاصل کرنا ہو تو وہ مل جاتا ہے بس پیاس ہوئی چاہیے۔“

”اب بھی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ سسلٹی بولی تو میں نے جواب کیا۔

”اگر یہ بات میں آپ سے کروں کہ آپ کلاس میں اتنی دلچسپی کیوں نہیں لیتی تو۔۔۔؟“

”جب حد سے زیادہ جس بڑھ جائے تو کھلی فضا میں اچھی لگتیں ہیں، یہی بات ہے۔۔۔ جو چیز پڑھنے کی ہوتی ہے، ضرور پڑھتی ہوں۔“ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی۔ ”اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں یا نعمان زیادہ لوگوں میں گھل مل کر نہیں رہتیں تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے، جو چیز اچھی لگتی ہے، اس کے حصول کی خواہش کرنی چاہیے، نہ کہ بے فائدہ اور نقصان دہ چیزوں کی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جب چٹھیاں کی جائیں، دوسروں کو برا بھلا کہہ کر اپنے اندر کی غلاطی کو چھپایا جائے تو ان لفظوں سے بدبو آنا شروع ہو جاتی ہے۔ گفتگو آلودہ ہو جاتی ہے۔ پھر ایسا پسند کرنے والا ہی وہاں بیٹھنا پسند کرے گا دوسرا نہیں۔۔۔“

”مگر بعض دفعہ حالات اور ماحول سے مفاہمت کرنا پڑتی ہے، تب پھر ہم کیا کریں؟“ میں نے کہا۔

”وہ وقت تو تب آتا ہے جب مجبوری ہوتی ہے اور مجھے کوئی مجبوری نہیں۔۔۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ انسان نے جس چیز کا غما یا تجربہ کیا ہو یا پھر اس چیز کے حصول کے خواہش شدت سے ہو تب ہی اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ گفتگو کرے گا۔ فیشن، کپڑے، دوسروں کی خامیوں پر نظر، اپنی حیثیت سے زیادہ خود کو پیش کرنا، یہ باتیں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور میں اس پر گفتگو بھی نہیں کرتی سو بدترین مافی جاتی ہوں لہذا ایسے لوگوں میں بیٹھنے کا فائدہ۔۔۔۔۔“ سسلٹی مزید کچھ کہتی لیکن نعمان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”او خدا کی پناہ!۔۔۔ یہ کیا فلسفہ دہ باتیں لے بیٹھے ہیں آپ۔۔۔ اور ساجد! ابھی تک وہ پوچھتے۔۔۔“ میں اٹھا اور پھر یاد دہانی کروانے چلا۔ وہیں مجھے ایک پہچان کا لڑکا مل گیا۔ اور میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ بھرا وہ چیزیں میرے تک پہنچا چکا تھا۔ اس لڑکے کی بات لمبی ہو رہی تھی مگر وہ میرے اٹھار میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ نعمان تو باقاعدہ ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی جیسے کہیں اس سے رخصت ہو کر میں جیسے ہی ان کے پاس پہنچا تب کھانے پینے کی ابتدا ہوئی۔

”یہ بیٹھری ابھی نئی ہے، خاصی مزیدار ہے۔“ وہ نعمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”پیاس لے اچھی لگ رہی ہے کہ آپ لوگ پہلے بالکل ہی پھکی گفتگو کر چکے ہیں۔“ نعمان کے کہنے کا انداز اور لہجہ ایسا تھا کہ خواہ وہ خود ہی ہنسی آگئی اور سسلٹی کا یہ پہلا قہقہہ تھا جو میں نے سنا۔ پھر یوں جکی پھٹکی باتوں میں نبھانے کتنا وقت بیت گیا۔ میں نے اوپر راہداری میں دیکھا تو سب دوبارہ نئے ٹریڈ کے لیے جا چکے تھے، کوئی بھی رہداری میں نہیں تھا اور کلاس روم کا دروازہ بند تھا۔۔۔ جب ایک مزاج کے لوگ مل جائیں اور گفتگو میں کوئی اختلافی بات بھی زیر بحث نہ ہو تو پھر باتیں پھیل جاتی ہیں، سناٹے نہیں بنتیں۔ بہت ساری ان کی باتیں نئے سوال چھوڑ جاتی ہیں اور اک حقیقی کا احساس رہ جاتا ہے اس وقت کچھ ایسے ہی محسوسات تھے جب دور سے میرے دوستوں نے اشارے سے گھڑی دکھائی اور مجھے احساس ہوا کہ اب ہاسٹل جانے والی بس آنے ہی والی ہے۔ میں نے اس طرف توجہ دلائی تو وہ دونوں بھی چونک گئیں تب اگلے دن تک کے لیے ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

نور سے واپس پر میں نے نعمانہ سے پوچھا کہ سسلی کیوں نہیں آئی تھی؟

”ہوسکتا ہے وہ ایسے ہنگامے پسند نہ کرتی ہو..... مجھے تو کبھی ری تھی کہ وہ آئے گی۔“ نعمانہ نے اپنی رائے دی۔ ہم نے بھی اتنی اہمیت نہ دی اور نہ ہی کسی محسوس کی تھی، بڑا ہنگامہ خیر دن گزر رہا تھا۔

پھر ایک دن کوئی تقریب تھی، کوئی انتظام میں لگا تھا اور کوئی اپنے اپنے تعلق کے دوستوں میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ آج ڈیپارٹمنٹ میں اک بچل سی تھی۔ میں ایک میگزین اٹھا کر رانداری میں آ بیٹھا تاکہ جب تک تقریب کا آغاز نہیں ہو جاتا وہیں بیٹھ کر ذرا اس میگزین کو سرسری نظر سے دیکھ لوں۔ وہ میگزین تو کیا دیکھتا تھا، ارد گرد دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے اور پھر باتیں چلتی گئیں۔ کوئی دوست بڑی اہم بات کر رہا تھا کہ یکدم سسلی کی آواز میرے کان پڑی۔

”ساجد! اگر آپ کے پاس وقت ہو تو پلیز، میری بات سنئے گا۔“ میں اس کی بات سنتا چاہتا تھا مگر میں دوستوں کو یوں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا لہذا یہ کہہ کر دوست کی جانب متوجہ ہو گیا کہ میں آتا ہوں لیکن اب وہاں ماحول ہی نہ رہا تھا۔ ہر چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ اس اعتماد سے اس نے بلایا تھا اور غالباً یہ پہلی دفعہ اس طرح بڑھ کر اس نے کسی کو پکارا تھا۔

”جاؤ۔۔۔ سن لو، کیا کبھی ہے؟“ ایک دوست نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کی میز پر حیاں اتر کر سامنے لان کے پاس کھڑی تھی۔

”جی فرمائیے۔۔۔؟“

”یہ نعمانہ کی قائل اور کتابیں ہیں پلیز، اسے دے دیجئے گا۔ میں مگر جا رہی ہوں۔“ اس نے قائل اور کتابیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”وہ کہاں چلی گئی اور آپ ابھی سے کیوں مگر جا رہی ہیں؟“ وہ میری طرف دیکھنے لگی پھر لمحو بھر بعد بولی۔

”اسے ہاسٹل گئے کافی دیر ہو گئی ہے، ابھی تک واپس نہیں آئی۔۔۔ مگر اس لیے جا رہی ہوں کہ پڑھائی تو ہو نہیں رہی، اکیلی بور ہو رہی ہوں۔“

”بھئی یہ تقریب بھی تو پڑھائی کا ایک حصہ ہے اور آپ اس میں ضرور شریک ہوں گی۔۔۔ جب تک نعمانہ نہیں آتی میں آپ کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ پھر میں اس کے پاس بیٹھا بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ تقریب شروع ہو گئی تھی، نعمانہ تب بھی نہ آئی تو میں نے کیا۔

”آئیں! تقریب میں چلتے ہیں۔۔۔ ہوسکتا ہے نعمانہ سیدھی وہیں چلی گئی ہو۔“

ہم دونوں ہال تک گئے، جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے بہت ساری نظریں ہماری جانب اٹھ گئیں۔۔۔ نعمانہ وہیں تھی، وہ اس کے پاس جا بیٹھی اور مجھے سب سے پیچھے سیٹ ملی۔ اس دن میں نے ارادہ کر لیا کہ حیات میں رکھی اس کتاب کو اب پڑھ لینا چاہیے۔

☆☆☆

معمول کے مطابق میں سے باہر آ کر میرے روم میٹ اور ہاسٹل کے دوستوں نے گھیر لیا۔ سب لوگوں کا اجتماعی سوال یہ تھا کہ وہ تو کسی سے بات نہیں کرتی تب ہمارے ساتھ اتنا تعلق کس طرح بن گیا؟۔۔۔ اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا، میں کیا کہتا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہمارے درمیان جو تعلق تھا اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ میں نے بس یہی کہہ دیا کہ وہ میری بہت اچھی کلاس فیلو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

شام ڈھلے میں اپنے کمرے پر "رہبر گدہ" پڑھ رہا تھا کہ میرا ایک کلاس فیلو جس سے میرا بڑا اچھا تعلق تھا، آ گیا۔ بہت دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد بولا۔

"آج کل سسٹی کے ساتھ لمبی ملاقاتیں ہیں۔۔۔ کیسی ہے وہ لڑکی۔۔۔"

"میں نے تو اسے اچھا پایا ہے۔ آپ مل کر دیکھ لیں۔"

"یہی تو بات ہے یار! میں اس سے مل نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم اس سے کیسا تعلق محسوس کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ میں نے وضاحت کی تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا اور کہنے لگا۔

"پتہ نہیں کیوں وہ ہمارے پاس بیٹھنا تو کجا، ہم سے بات بھی نہیں کرتی۔"

انتا کہہ کر اس نے موضوع بدل لیا اور میں سوچنے لگا کہ ضروری نہیں آدمی کا ملنے جلنے یا تعلق ہو جانے کے بعد پتہ چلے بلکہ اس سے بھی پہلے دیکھنے کے انداز میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ انسان کیا چاہتا ہے۔ اور وہ نظریں مثبت انداز کی ہیں یا منفی سوچ کی نماز ہیں، پھر اسی تاثر کی بنیاد پر ہی تعلق کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

☆☆☆

میں کلاس روم سے باہر راجداری میں کھڑے ٹیچر کے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا، مقصد صرف وقت گزاری تھا۔ جب ہی وہ میرے قریب آ گئی۔ میں نے اس کی آمد محسوس تو کر لی لیکن بولا کچھ نہیں۔ وہ شاید اس خاص چہرے کی تلاش میں تھی جیسے میں دیکھ رہا تھا، مایوس ہو کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"چہرے۔۔۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"چہروں میں کیا ہوتا ہے؟" اس نے بات بدھائی۔

"بہت کچھ۔۔۔ چہرے سے کوئی بھی انسان عاری نہیں، چہرہ اس کا اپنا ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔۔۔ ناک، آنکھیں، ہونٹ، چہرے کی بناوٹ میں وہ عام انسانوں کی مانند ہوتا ہے لیکن دنیا بھر میں وہ ایک ہی ہوتا ہے اور وضع کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کو کس قسم کا بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔ چہرہ انسان کا تعارف ہے۔ خاص علاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

”میں بہت سارے ایسے چہرے دیکھ سکتی ہوں جو دیکھنے میں بڑے معصوم اور پیارے لگتے ہیں مگر ایسا چہرہ رکھنے والے لوگ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔۔۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو، یہ بتائیں کہ گرم گرم چائے کے ساتھ کچڑے کھانا کیسا لگے گا؟“

”اس وقت جب کہ آپ کا ساتھ ہو، بہت اچھا۔۔۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کینٹین تک چلا جائے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو تین دن ہو گئے، نعمان نہ آئی۔ میں نے سلمیٰ سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہی تو اس نے لاطینی کا اظہار کیا۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد وہ آئی تو خاصی بدلی ہوئی تھی۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ خاصا زیور پہنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بس کے انتظار میں پختہ روش پر بیٹھی ہوئیں تھیں کہ میں قریب سے گزرا اور نعمان نے پکارا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔

”پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ اتنے دنوں کہاں غائب رہیں؟“ میں نے جاتے ہی سوال کیا۔

”آپ ٹھہرے غافل۔۔۔ ارد گرد کی خبر آپ نے لیجی نہ ہوتی۔ آپ کو کیسے پتہ چلے کہ میں کیوں نہیں آئی۔۔۔ ارے بھئی میری منگنی ہو گئی ہے۔ کمال ہے صبح سے یہ سونے کی چڑیاں کلکنا رہی ہوں اور آپ نے پوچھنا کیا، سنا تک نہیں۔۔۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”منگنی مبارک!۔۔۔ کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“

”بہت اچھا۔۔۔ اک تحفظ کا احساس ہے۔ مزید اعتماد آ گیا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا تو سلمیٰ بولی۔

”ہمیں کون سا تحفظ نہیں ہے یا ہم میں اعتماد نہیں ہے؟“

”سلمیٰ! آپ کی منگنی ہو گئی؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“

”ہو جائے گی، یوں منہ بسور نے سے فائدہ۔۔۔؟“ میں نے کہا تو ایک دم توجہ لگا اور قریب کمرے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تب سلمیٰ

نے کہا۔

”جب تک بس نہیں آتی آپ ہمارے پاس بیٹھیں۔۔۔“

”میں کھڑا ہوں آپ کے پاس۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ ادھر آ کر ہمارے پاس بیٹھیں۔“ میں نے انکار کیا تو وہ ضد پر اتر آئی۔

”بھئی اتنے سارے لوگ کیا کہیں گے کہ میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔“

”دیکھتے رہیں لوگ ہمیں ان کا ڈر ہے۔“ تب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

بس وہی دن غضب کا تھا۔ بہت سارے لوگوں کو ہمارا یوں بیٹھنا اچھا نہ لگا۔ میں تین اطراف سے گھر گیا۔ ان میں میرے ہاسٹل کے

دوست تھے۔ انہی دوستوں میں ایک میرا دم میٹ عابد تھا۔ اسے بڑا تمس تھا کہ میں سسلی سے کیا باتیں کرتا ہوں، میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ دوسرا اسرار تھا جو بائبل کا نہیں بلکہ اسی شہر کا رہنے والا تھا، وہ اکثر مجھ سے سسلی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھے کریدتا رہتا کہ آخر میرا سسلی سے کیا تعلق ہے؟ پھر ایک دن وہ بھی کھل گیا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے جبکہ مجھے یہ ابھی طرح معلوم تھا کہ یہ سنورا قسم کا لڑکا ہے۔ تیسرا کالپی تھا اسی شہر کا ایک اور لڑکا جو اتنا امیر نہیں تھا لیکن وہ جو کچھ تھا اس سے بڑھ کے خود کو پیش کرتا تھا۔ روزانہ گاڑی پر آنا اس کا معمول تھا۔ اسے بھی سسلی کی آنکھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ یہ سب اس کے قرب کے خواہاں تھے۔ پھر بہت سارے ایسے واقعات ہوئے جس سے کلاس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، وہ دوسروں کی خامیوں کی ٹوہ میں رہنے والے لوگوں کو اک نئے موضوع پر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جیسے میں ان لوگوں کے درمیان حائل ایک رکاوٹ ہوں۔ اس بات کا انہوں نے کئی بار مجھے احساس بھی دلایا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے ان کے درمیان دیوار نہیں بننا چاہئے۔ سسلی بذات خود بخود ارہے۔ وہ اچھا برا اپنا خود سمجھتی ہے اور پھر میرا اس پر کیا حق ہے جو میں جتاؤں یا اس پر کوئی پابندی لگاؤں؟ سسلی اگر قدم آگے نہیں بڑھائے گی تو وہ ایسا ہو جائیں گے لیکن اگر وہ قدم آگے بڑھاتی ہے تو پھر یہ سسلی پر منحصر ہے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ جس سے چاہے تعلق رکھے۔ لوگوں نے تو یہی سمجھا تھا کہ شاید میرا اس سے کوئی خاص تعلق ہے اس لیے پابندیاں لگائی ہوئیں ہیں۔ سو میں یہی سوچ کر اس سے اپنا تعلق کم کرنے لگا۔۔۔ شاید میں بہت بزدل تھا کیونکہ میں لوگوں کی نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی آنکھ میں میرے لیے حقارت یا طعنے ہوا اس سے بڑا اور سانحہ میرے لیے کوئی نہیں ہے۔ اب اگر سسلی سے ملتا بھی تو عابد میرے ہمراہ ہوتا، میں اسے تنہا کر خود غائب ہو جاتا۔ وہ کیا باتیں کرتا ہے یا سسلی اس سے کیا کہتی ہے، میں نے کبھی یہ پوچھا ہی نہیں تھا اور مجھے اب ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے اس کے بارے میں بہت ساری باتیں کہتا رہتا جنہیں میں سن کر بھی مال جایا کرتا۔ یوں میں اس سے دور ہوتا چلا گیا اور جو لوگ اس میں دلچسپی رکھتے تھے اب اس کے نزدیک ہونے لگے لیکن وہ میرا اب احترام کرنے لگی تھی۔ جب کبھی موقع ملتا اور میں اکیلا ہوتا تو سیدھی میرے پاس آ جاتی اور وہ باتیں مٹانے لگتی جو دوسرے لوگ میرے بارے میں کہتے رہتے تھے۔ پھر نعمانہ نے بھی آنا کم کر دیا، اس کی کوئی گھریلو عیبتیں نہیں۔ وہ اکیلی ہو گئی لیکن اس کی طرف بڑھنے والے قدم میں دیکھ رہا تھا، وہ اگر اسے صرف اپنے لیے ملے تو ٹھیک تھا، میں بھی اتنی اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن وہ لوگ میری خامیاں اور میرے بارے میں عجیب و غریب قسم کی باتیں کرنے لگے، جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ یہ ہندے کا اپنا ظرف ہوتا ہے، یہ سوچ کر میں نے اہمیت ہی نہ دی۔ اس معاملے میں عابد ذرا بھی پیچھے نہیں تھا۔ وہ اسے میرا دوست سمجھتی اور اس کا یہ سمجھنا بھی ٹھیک ہی تھا کیونکہ میرے ساتھ رہتا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے اور وہ دن آگیا جب پہلا سال گزر گیا اور اگلے دن ہم نے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ دوستوں نے اس آخری ملاقات کو یادگار بنانے کے لیے شہر کے ہوٹل میں ایک پارٹی کا اہتمام کر ڈالا۔۔۔ جیسے کسی نے کہا ہے کہ دس بندوں میں سے نو ماننے والوں کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا ایک نہ ماننے والے کا دکھ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اور لوگ میرے بارے میں اپنے طرف کے مطابق باتیں کرتے رہتے لیکن وہ دن قبل سسلی نے ایک ایسی بات مجھ سے منسوب کر دی جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس پارٹی میں سسلی بھی آئی۔ میں اکیلا کھڑا سارے انتظامات کو دیکھ رہا تھا

کہ وہ میرے قریب آگئی۔

”بڑے مصروف ہیں آپ۔۔۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ لہجے میں خاماخصہ مہرا ہوا تھا۔

”مجھ سے کچھ کہا؟“ میں نے انجان بننے ہوئے کہا۔

”شکر ہے آپ نے سن لیا۔ کہاں رہتے ہیں آج کل آپ؟“

”ہیں۔۔۔“ میں نے انتہائی مختصر جواب دیا تو وہ گلہ کرنے لگی کہ میں اس سے بات کیوں نہیں کرتا؟ اب میں اس سے عشق تو فرما نہیں رہا تھا کی اس سے گلے شکوے کرتا یا اپنی صفائیاں پیش کرتا، بس ادھر ادھر کی باتوں میں نال دیا وہ مطمئن نہ ہوئی۔

”ضرور کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“

”بھئی مجھے بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ آپ میری بہت اچھی نکالاس فیلو ہیں، اچھی دوست ہیں اگر آپ سمجھیں۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس سے زیادہ آپ کے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔۔۔ ہاں، اگر آپ کا کوئی مسئلہ ہو تو میں حاضر ہوں۔“ یہ کہہ کر میں چٹکے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ خاموش رہی جیسے سوچ رہی ہو۔ کوئی جواب نہ پا کر میں یونہی ایک طرف بڑھ گیا۔

اگلے دن اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ میری حالت یہی تھی کہ کتابیں خرید کر رکھ دیں اور انہیں پڑھنا کسی اور وقت پر اٹھا رکھا، بس صبح ہوتے ہی گھر سے لکھا اور پھر دوست ہوتے اور شہر کے حالات۔۔۔ انہیں دنوں سٹلی کا خط آ گیا جس میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کن کتابوں سے امتحان کی تیاری کرے؟ اب میں اسے کیا بتاتا، بس جو کتابیں خرید لی تھیں ان کے بارے لکھ دیا۔ تب ہی مجھے بھی احساس ہوا کہ اب پڑھنا چاہیے۔ لہذا میں نے پڑھائی شروع کر دی اس سے خط کتابت جاری رہی سوائے پڑھائی کے اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ پھر جس دن میں نے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس رات گھر سے سٹلی کو فون کیا کہ میں صبح پہنچ رہا ہوں۔ مجھ سے ہاسٹل میں رابطہ کر لیں۔

☆☆☆☆

جب بندہ انتہائی بوریٹ محسوس کر رہا ہو تو پھر بے وقوفیاں بھی اچھی لگتی ہیں، ایسی حماقت زندگی کا احساس دیتی ہے جس میں تھوڑی خوشی کے ساتھ دقت گزاری ہو۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا، میں کوئی شرط ہار گیا جس پر مجھے مٹھائی کھانا پڑی۔ میں اپنے دوست شوہر کے ساتھ مٹھائی لے کر آ رہا تھا کہ گلی نے پیچھے سے آکر کارہارے پاس روک دی۔ ہم بیٹھنا اور ہاسٹل آگئے۔ وہ گاڑی لاگ کرنے لگا۔ میز میاں چڑھتے ہوئے شوہر نے کہا۔

”آج کا گلی سے تھوڑا مذاق کرتے ہیں۔ تم چپ رہنا۔“ مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ کیسا مذاق کرے گا۔ مٹھائی کھانے کے دوران کاظمی نے پوچھ لیا کہ یہ کس خوشی میں ہے؟ شوہر فوراً بولا۔

”بس کسی کا کسی کو فون آیا ہے۔۔۔“

”کس کا، کس کو۔۔۔؟“ کاظمی نے پوچھا تو شوہر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اے کیا گیا ہے۔“ ہاتی رہی بات کہ کس کا؟ تو میں نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ آج کل آپ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔“ اس نے بات اگرچہ اشارہ نامی تھی اس طرح کہ فوراً وہ سمجھ جائے۔ میں نے دیکھا کالمی کو یکدم ہی پسینہ آگیا اس شدت سے کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر چل دیا۔ وہیں بیٹھے سارے دوست اس کی اس حالت پر دم بخود رہ گئے۔ اسی رات کا بچھلا پہر تھا کہ تنویر نے آکر مجھے جگا دیا۔

”منہ ہاتھ دھو کر ذرا لان میں آؤ، میں نے تم سے بات کرنی ہے۔“ میں لان میں پہنچا تو وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

”بتاؤ، کیا بات ہے؟“ میری آواز نیند سے جوبھل تھی۔

”یار! آج جو کچھ ہوا میں اس پر بہت پریشان ہوں۔“ کالمی تمہارا مخالف ہو جائے گا۔“

”پھر کون سی قیامت آجائے گی؟“

”میرے بچوڑے غماق سے ہو سکتا ہے کہ سٹگی بھی تم سے متغیر ہو جائے۔۔۔“ وہ واقعی پریشان تھا۔

”ہوتی ہے تو ہو جائے۔۔۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمہارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔۔۔“ وہ سمجھلا سا گیا۔

”ایک اچھی کلاس فیلو سے زیادہ وہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔

”یار! مجھ سے تو جھوٹ مت بولو، کیا کچھ نہیں کرتے تم اس کے لیے؟۔۔۔ کوئی بندہ اس کے خلاف بات نہیں کر سکتا، دوسری لڑکیوں کی طرح

وہ محفلوں کا موضوع نہیں ہے، دور رہ کر اس کے تعلیمی مسائل حل کرتے ہو اور وہ تمہارے بارے میں معلومات لیتی پھر رہی ہے۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟“

”ہاں تنویر! یہی تعلق ہو سکتا ہے جب کوئی کسی انوٹ بند من میں بندھ جائے لیکن میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے اس کا

بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس اس کتاب کے حوالے سے انسانی فطرت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ نفرت، منافقت، محبت، اعتماد اور خود غرضی جیسے

جذبے کی گہرائیاں معلوم کر رہا ہوں اور پھر کوئی تعلق نہ بھی ہو تو کسی کے لیے کچھ کیا جائے، اس سے بڑھ کر میرے خیال میں اور کوئی خوشی نہیں

ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہو گئے۔

اسی دوپہر میں اپنے کمرے میں پڑاؤں سے دیکھ رہا تھا کہ ہوشل کے ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ آپ کا فون ہے۔

”ہیلو۔۔۔ میں سٹگی بات کر رہی ہوں۔“ اس کی آواز کی شوخی اور لہجہ انتہائی نرم تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ فیسے کے آثار کہیں

نہیں ہیں۔

”فرمائیں، کیسے یاد کیا ہمیں؟“

”یونہی بس ایک بات کسفرم کرنا تھی۔۔۔“ اس نے کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ لازمی اب یہ مجھ سے کل کے واقعہ کے بارے میں پوچھے

گی۔ میں جتنی طور پر تیار ہو گیا۔

”پوچھیں۔۔۔“ میں نے کہا تو وہ نصیباتی باتیں کرنے لگی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ اسے کوئی بات نہیں

پنچب میں نے اپنی طرف سے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھی۔ پھر یونہی اوٹ چانگ باتیں کرتی رہی۔ صرف اس کی وجہ سے کہ میرا لہجہ خوشگوار اور موڈ اچھا تھا کافی دیر بعد ہو گئے تھے۔

”اچھا۔۔۔ جلدی بات ختم کریں، میں نے ہنڈیا چولہے پر رکھی ہوئی ہے اور کچن سے بول رہی ہوں۔۔۔“

”بات میں نے شروع نہیں کی بلکہ آپ نے فون کیا ہے، آپ فون بند کر دیں۔۔۔ ویسے کیا پکارتی ہیں آپ؟“

”پتے پکارتی ہوں۔۔۔۔۔ اس نے بتایا۔

”ارے۔۔۔۔۔ یہ تو ایک خاص جانور کی خوراک ہے آپ کا کہیں ریس لگانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟“ تبھی ایک بھر پور قبضہ سنائی دیا پھر وہ جھٹکتے ہوئے بولی۔

”کل آپ ہجر کے بعد مجھے ملیں۔۔۔“

”آپ تک پہنچنے میں مجھے کم از کم آدھا گھنٹہ لگے گا۔۔۔ انتظار کر لیں گی آپ؟“

”بھئی تو مصیبت ہے، آپ لڑکے اور ہم لڑکیاں ملیدہ و ملیدہ امتحان دے رہے ہیں۔۔۔ خیر، میں مہرین وغیرہ کے پاس ہاسٹل میں انتظار کر لوں گی۔“

پھر اگلے دن باوجود کوشش کے میں نہ جاسکا۔ لاہور سے میرا انتہائی قریبی دوست آ گیا جیسے میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے فون کر کے بتانا چاہا تو وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

اس روز شام کے وقت ہم سب دوست بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ عابد نے اچانک کہا۔

”بھئی، مساجد کے لیے اہم پیغام!۔۔۔ تو پھر مانیں۔۔۔ ان کا یہ پیغام ہے کہ مساجد مجھ سے بچ کر رہے ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“ میں دھیرے سے مسکرا دیا اور بھئی سمجھا کہ میں نہیں گیا اس لئے ناراض ہے مگر تو میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

”آج میں گرلز ہوسٹل گیا تھا، وہاں مجھے مہرین نے سسلی کا پیغام دیا ہے کہ مساجد نے جو باتیں کہیں وہ انتہائی گھٹیا اور کمینہ حرکت ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گی اب اگر اس نے ملنے کی کوشش کی۔۔۔ اس نے تو اپنی بات کہہ دی مگر دوست میرا مذاق اڑانے لگے، اک شور مچا گیا۔ ایک تو لہک لہک کے گانے لگا۔

”فٹ گئی تڑک کر کے۔۔۔“

میں یہ چاہتا تھا کہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کروں تاہم سسلی مجھ سے خود بات نہ کرے لیکن خیر بھند تھا کہ مجھے اس سے بات کر لینی چاہیے، اور اگر میں نے بات نہ کی تو وہ خود کر لے گا، ہو سکتا تھا کہ تو میرے بات کر لینے پر بات بات سے نکل جاتی اور میں کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوست اسے ڈیپارٹمنٹ میں مذاق بنا کر رکھ دیں۔ جس طرح ایک اور لڑکی نے بدتمیزی کی تھی اور وہ مذاق کا نشانہ بن گئی تھی۔ وہ مہرین ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھی اور آج اس نے بدلہ لے لیا تھا۔ میں اس وقت کال آفس گیا۔ عابد خواہ مخواہ ہی میرے ساتھ تھی ہو گیا۔ میں نے بھی اسے نہ روکا۔ رابطہ ملتے ہی اس کی آواز آئی۔

”ہیلو۔۔۔“

”میں ساجد بات کر رہا ہوں۔“

”کیوں فون کیا آپ نے؟۔۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔ آج میری کلاس فیلوز نے صرف آپ کی وجہ سے بہت ذلیل کیا۔“ اس کی آواز میں کرب تھا۔

”کیوں؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”انہیں آج ہی تو موقع ملا تھا اور پھر آپ کے نہ آنے سے مجھے یقین ہو گیا۔“

”سوری۔۔۔“

”آپ صرف سوری کہہ کر بات ختم کرنا چاہتے ہیں؟۔۔۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اندر سے اتنے گندے ہوں گے۔“ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی اور وہاں میں جتنی مرضی چاہے معافیاں دیتا رہتا۔ اس نے کسی پر کان نہیں دھرتا تھا۔ پبلک کال آفس میں کچھ لوگ کمرے سے اترے اور پھر عابد کی موجودگی نے بھی مجھے انتہائی ڈسٹرب کر دیا تھا۔۔۔ میں نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا تھا۔ سسلی کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا اسے مجھ سے اصل بات پوچھنا چاہیے تھی تب میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”سوری۔۔۔ راجک نمبر۔“

”آسمند کبھی مجھ سے بات مت کیجے گا۔“ سسلی نے انتہائی غصے سے کہا تو میں نے فون رکھ دیا۔ پیسے دے کر میں باہر نکلا تو عابد نے پوچھا۔

”کس نے اٹھایا تو فون؟“

”اس کا باپ تھا۔۔۔ سسلی نہیں ملی۔“ میں نے اس سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ اب مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

تعلق کی بنیاد ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ کہیں پر بھی دراڑ پڑ جائے تو محبت، پیار اور خلوص کی عمارت کھڑی کرنا بے وقوفی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اور سسلی کے لیے پر خلوص ہوں اور اگر حالات نے اور ارد گرد کے لوگوں نے اسے مجھ سے تشویر کر دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟۔۔ اس کا اعتماد تو اس وقت ہی نہ رہا تھا جب اس نے بات سنی تھی اور مجھ سے کسفرم کئے بغیر یقین کر لیا۔ رات تک مجھے معلوم ہو گیا کہ کالٹی نے سسلی کو فون کر کے ساری بات کہہ دی تھی اور یقینی بات ہے کہ اس نے یہ سارا واقعہ اپنے انداز میں کہا ہو گا اور عابد نے مگر ٹر ہاسٹل میں سب لڑکیوں کے سامنے اپنے انداز میں بات کہہ دی۔ اس کا قصہ ٹھیک تھا، کوئی اور اس کے بارے میں غلط بات کہتا تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا، اس کے دکھ کی انتہا اس لیے تھی کہ اس معاملے میں اس کے تئیں میرا نام آتا تھا۔ میں بہر حال ساری رات سوچتا رہا، ایک ٹپ آنکھ نہ لگی۔ میرے اور اس کے درمیان تعلق کی بنیاد کیا تھی اور میں اس کے بارے کس انداز میں سوچتا رہا ہوں مگر کیا ہوا کہ وہ ناراض ہو گئی۔۔۔ دکھ کی اک لہر تھی جو بے چین کئے دے رہی تھی۔ بہت

سارے لوگوں کی محبت ہونے کے باوجود ایک شخص اگر ناراض ہو جائے تو ہونے والا دکھ پیانا نہ بن جاتا ہے۔ جس قدر دکھ زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ شخص اس کے نزدیک مستحکم ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نوٹس پھیلائے بظاہر پڑھ رہا تھا لیکن خیالات کہیں اور تھے۔ چڑا اسی نے آکر بتایا کہ وارڈن آفس میں آپ کا فون ہے۔ میں گیا تو سہیلی کا فون تھا۔

”آپ کل کیا کہتا جا رہے تھے۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی میں نے واضح طور پر محسوس کی۔

”بس یہی کہ موسم کیسا ہے۔۔۔؟“ میں نے بے لگی سی بات کہی۔

”نہیں پلیز! مجھے بتائیں۔ لیکن اگر آپ ناراض ہیں۔ نہیں بتانا چاہتے تو میرا کوئی ذریعہ نہیں۔“

”کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی۔“

”ساجد! اگر آپ نے کوئی ایسی ویسی بات کی بھی ہے تو میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔“ تو گویا اس کو یقین تھا کہ میں نے غلط بات کہی ہے بجائے اس نے وہ اب بھی کفر فرم کرے کہ میں نے یہ بات کی ہے کہ نہیں؟ وہ مجھے معاف کر رہی تھی۔ اچانک غصے کا دھواں دماغ میں بھر گیا۔ میں نے زور سے ”شٹ اپ“ کہہ کر فون رکھ دیا اور سگلتے دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ شام تک میں تارل ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب یہ بات امنی کی ہے کہ میرا سہیلی سے کوئی تعلق تھا۔

☆☆☆

امتحان ختم ہوئے اور ہم اپنے گھروں کو لوٹ آئے تب سہیلی کا ایک طویل ترین خط مجھے ملا جس میں اس نے معذرت کی اور نہ ہی تجدید تعلق کیا بلکہ اس خط میں لکھی گئی باتوں سے یہ عیاں ہوتا تھا کہ جیسے درمیانی مہدمگ گشتہ باب ہو، جیسے کسی کتاب کی جلد بندی کرتے وقت کسی اور کتاب کا اضافی باب غلطی سے لگ گیا ہو اور جس کا کتاب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا تو کچھ عرصہ بعد پھر خط آگیا۔ اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ یوں چٹھیاں بھی گزر گئیں۔ انہی دنوں بڑے بھائی نے کہا کہ کام حریہ پھیل گیا ہے، تھوڑا عرصہ ان کے کام کی دیکھ بھال کروں۔ میں روزانہ ساعت پر جانے لگا۔ تین ماہ حریہ گزر گئے۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ یونیورسٹی کا چکر لگا آیا تھا۔ ایک دن میں سائٹ سے واپس آیا تو گھر والوں نے کسی لڑکی کے فون آنے کا بتایا۔ پھر رات گئے سہیلی کا فون آگیا۔

”آپ اب تک ناراض ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں تو۔۔۔“

”آپ نے میرے غلطوں کا جواب نہیں دیا اور یہاں آتے بھی ہیں تو مجھ سے بات نہیں کرتے۔“

”میں آپ سے کیا بات کروں؟۔۔۔ وہ موسم اب بیت گیا ہے۔۔۔“ میں نے کہا۔

”موسم پھر بھی آسکتا ہے۔ یہ تبدیلی فطری ہوتی ہے۔“ اس نے جواباً کہا تو میں نے بات کو اور طرف موڑ دیا۔

”کوئی کام تھا آپ کو مجھ سے۔۔۔۔۔؟“

”نہیں تو۔۔۔ بس آپ۔۔۔۔۔“ اس نے اتنا ہی کہا تو میں نے بات کاٹ کر فوراً کہا ”خدا حافظ“ اور یہ ورکر ٹیل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جب نام خارج ہونے کا نوٹس آیا تو میں نے یونیورسٹی کا رخ کیا۔ سو دو بار وہ کلاسیں لینے لگا۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ سسٹمی سے بات ہو جائے بلکہ یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ جہاں ہو اس طرف نہ ہی جاؤں۔ چند دن اسی طرح گزر گئے مگر جی لوگوں کو یہ مسموم ہو گیا کہ اب واقفان کے درمیان گہری ناراضگی ہے تب کاظمی نے پر نکال لیے۔ اسرار جو عشق سے دستبردار ہو چکا تھا پھر سے اس کے عشق میں جھٹلا ہو گیا۔ لوگ اس کے متعلق بڑی فضول جسم کی باتیں کرنے لگے، اس کی بے باکی کو بے حیائی سے تعبیر کرنے لگے اور اس دن میں حیران رہ گیا جب عابد نے بھی اپنے عشق کا اظہار کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد تنویر کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے ساری بات جا کر سسٹمی کو بتادی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ پھر اسی دن رابہاری میں جاتے ہوئے سسٹمی نے مجھے روک لیا۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ میرا اس سے تعلق تو رہا لیکن لوگوں کے سامنے نہیں، ٹیلی فون اور خط کے ذریعے سلسلہ رہا۔ میں نے جیسا کہا اس نے ویسا کیا۔ اسرار کو ساری کلاس کے سامنے جھڑپا دیا، کاظمی نے صورت حال بھی اور وہ پیچھے ہٹ گیا اور عابد کو اس نے بھائی بتالیا۔ اس نے عابد کو ایک نوکر کی حیثیت دے دی، ایک معمولی پنسل بھی اگر لانی ہو تو وہ ”عابد بھائی“ لا کر دے رہا ہے۔ میں اور سسٹمی بیٹھے ہیں تو چائے کا آرڈر ”عابد بھائی“ دینے جا رہے ہیں۔ تب کلاس فیلوز نے بھی اس کو ذلیل کرنا شروع کر دیا، اسے اس طرح کے فقروں سے نوازتے کہ یار! آج تیری بہن بن ٹھن ہو جانے کی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ کیوں ابھی عابد! تمہاری بہن سے باتیں کر لیں؟۔۔۔ عابد! تمہاری بہن آج فلاں کے ساتھ لان میں ہنس رہی تھی۔۔۔ یار! کسی عالم سے پوچھا جائے کہ منہ بولی بہن سے نکاح جائز ہے؟ کم ظرف لوگ محفلوں میں جس انداز سے باتیں کرتے تو یوں لگتا جیسے ضمیر نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ سسٹمی کا مزاج بھی اب تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکوں میں زیادہ بیٹنے لگی تھی، پھر لڑکے بھی خواہ مخواہ کی جھوٹی باتیں منسوب کر کے مجھے سناتے۔ مجھے ڈینی اذیت تو ہوتی لیکن کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کم از کم ایک دلدھارے خیر دار کروں تاکہ وہ سمجھ کر ہو کچھ بھال کر قدم رکھے۔ میں نے نعمانہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا، اسی دن مجھے موقع مل گیا اور وہ اکیلی دفتر میں کسی کام سے گئی تھی۔

”نعمانہ! ایک منٹ ذرا بات سننے گا۔“

وہ واضح طور پر میری بات سنی ان سنی اور نظر انداز کر کے چل دی، اس قدر نفرت۔۔۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ پھر دل نے کہا کہ تم اپنی طرف سے فریضہ بھادو، آگے ان کی قسمت۔۔۔ میں سسٹمی کے پاس گیا۔ اس نے بھی انتہائی نفرت سے کہا کہ میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ میں دل گرفتہ نہیں ہوا بلکہ پرسکون ہو گیا کہ میرے ضمیر پر بوجھ نہیں رہا۔

☆☆☆

ہارے لیے وہ رات یونہی تھی۔ میں تو میرے ساتھ بیٹا پرانی باتیں دہرا رہا تھا کہ چاک اس نے کہا۔

”یار! سلی سے تمہارا عشق خوب چلتا اگر عابد درمیان میں نہ آ جاتا۔“

”نہیں کس بے وقوف نے کہا ہے کہ میں اس سے عشق کرتا تھا؟“

”وہ تمہارا اس سے تعلق، قدم قدم پر تحفظ، کسی کا اس کے ہارے میں غلط سوچنے والے پر غصہ آ جانا، کلاس انکیشن میں اپنی نشست اس کو

دے دینا۔۔۔ عجب، ٹیلی فون، آخر یہ کیا تھا؟“

”نہیں، یہ بات نہیں، جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے اور میں نے جو حالات دیکھے ہیں ان کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ اس سے شادی

نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے کہا ہو گا کہ والدین کو بھیج دو۔۔۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔۔۔ میں اس سے شادی کر سکتا تھا، والدین کی طرف سے اجازت ہے کہ میں جس کو پسند کر لوں اس سے شادی ہو

جائے گی۔ ذات برادری کا، دولت کا یا کوئی اور مسئلہ نہیں تھا۔“

”تو پھر یہ اسی کے لیے کیوں؟۔۔۔ اور بھی کلاس فیلوز تھیں اور پھر اتنا کچھ وہ بھی دور رہ کر، آخر کس لیے؟“

”ضروری نہیں کہ ہر لڑکی عشق کے قابل ہو اور میرے جذبات اتنے سستے نہیں ہیں۔۔۔ میرے بھائی! میں اس سے عشق نہیں کرتا تھا بلکہ

دل کی گہرائیوں سے عزت کرتا تھا۔ میں نے اسے اپنا مان لیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ تعلق نہ رہا تو پھر کیا ہوا؟۔۔۔ بتاؤ، آج تک میں نے یہ کہا کہ مجھے

سلی سے عشق ہے یا اس سے محبت کرتا ہوں؟۔۔۔ یہ عمل میرے لیے تجربہ ثابت ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وہ عیال میں رکھی ہوئی کتاب کی مانند

تھی۔ میں نے اسے پڑھا اور ہر اچھا پڑھنے والا کتاب کی نہ صرف عزت کرتا ہے بلکہ اس کو سنبھال کر پڑھتا ہے۔ اس پر اپنا نام نہیں لکھتا، لکیریں نہیں

ڈالتا، اس کو خراب نہیں کرتا اور نہ ہی اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔۔۔ باقی رہی بات کہ کتاب کیسی ہے؟ تو یہ ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے۔ چاہے

جتنی بڑی کتاب ہو، اس میں چند اچھی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں اور تو یہ! اس کتاب کے توسط سے میں نے منافقت اور غلوں کی پہچان کرنا سیکھ لی

ہے۔۔۔ وہ کتاب میری ملکیت نہیں تھی اور تم کو وہ ہو کہ میں نے آج تک ملکیت کا حق نہیں جتایا، اس پر کوئی نہیں لکیر نہیں کھینچی بلکہ گرد و غبار سے بچایا

ہے اور اب احتیاط سے اسے دوبارہ عیال میں رکھ دیا ہے۔“



ماں جیسی

فون زاری بیگم ہی نے اٹھایا تھا، لیکن اس کی "ہیلو" مجھے عجیب سی لگی۔ میں جو کھکتے ہوئے منفرد سے لوج دار لہجے میں توقع کر رہا تھا، اس کی بجائے مجھے کمر دار اور خشک لہجہ سننے کا ملایا تھا۔

"خیریت تو ہے زاری بیگم، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے چند تمہیدی فقرہوں کے تبادلے کے بعد اس کی آواز کے حوالے سے پوچھا تو وہ غصے میں لپٹے ہوئے بظاہر نرم لہجے میں بولی۔

"کیا بتاؤں میں آپ کو، ان دنوں میں ایک ایسی پریشانی میں گھر گئی ہوں، جو کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔"

"پریشانی، بتائیں سکتی، معاملہ کیا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا

"پھر کسی وقت سہی، اس وقت تو آپ یہ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔" اس نے واضح طور پر میری بات نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے لفظوں میں کام کی بات کرنے کو کہا۔ تو میں نے بھی اس کے معاملے کو چھیننا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے سیدھے اپنے مطلب پر آ گیا۔

"آپ نے یہاں آفس آنا تھا۔ اور پھر آپ نے کچھ ماڈل گرلز سے بھی ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔ میری فونو گرافر روزانہ مجھ سے پوچھتی ہے اور آپ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔" میں نے صاف انداز میں اس سے پوچھا۔

"او۔ ا" اس نے یوں کہا جیسے وہ بھول گئی ہو، پھر لہجہ بھر تو قف کے بعد بولی "مجھے سب یاد ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں ذہنی طور پر اس قدر پریشان ہوں کہ۔۔۔ بس کیا بتاؤں۔ پلیز یہ سب کسی اور وقت پر رکھ لیں۔ میں شاید ان دنوں کوئی بھی وعدہ نبھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" اس نے اسی کمر دار اور خشک لہجے میں کہا تو میں نے مزید بات کرنا مناسب ہی نہ سمجھا، سو چند ادوائی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

زاری بیگم اداکارہ تھی، کسی زمانے میں جب ٹیلی وژن کی رنگین نشریات شروع ہوئیں تھیں، انہی دنوں زاری بیگم نے محشیہ اداکارہ اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔ وہ بھرپور جوان، حسین اور معصوم چہرے والی اداکارہ تھی۔ جس نے ایک ہی ڈرامہ سیریل کے بعد شہرت پا لی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں ایک ہی ٹی وی چینل تھا اور عوام وہی چینل دیکھنے پر مجبور تھے۔ اداکار بھی اتنے ہی سے تھے کہ ان کے چہروں کو بخوبی یاد رکھا جاسکتا تھا۔ ایسے میں کوئی نیا اور متوجہ کر لینے والا چہرہ بہت جلد مقبول ہو جاتا تھا۔ ابھی اس نے عوام کے ذہنوں میں جگہ بنائی ہی تھی کہ اچانک وہ منظر سے غائب ہو گئی۔ اس کے بارے میں مختلف افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کسی نے سرفی جہادی کہ وہ شادی کر کے وطن سے باہر چلی گئی ہے، کوئی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ وہ کسی جاگیردار کو پسند آگئی ہے، اس لیے وہ منظر سے غائب ہو کر اسے پیاری ہو چکی ہے۔ ایک میگزین نے یہ تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ بیروین سہگل کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے اور اب دہلی کی کسی ٹیل میں ہے۔ ہر بات کے ساتھ ایک لمبی کہانی بھی

تھی۔ انوار چنگہ پھاڑکی چوٹی سے گرنے والی برف ہوتی ہے۔ جوں جوں چمپے کرتی ہے وہ تو وہ بن جاتی ہے اور پھر تو وہ پگھل کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسی طرح وقت کے ساتھ یہ انوار بھی دم توڑ گئیں۔ زاری بیگم قصہ پارینہ بن گئی۔ میں جب شوہر سے متعارف ہوا تو میں اس پس منظر سے واقف نہیں تھا۔ تاہم ایک اشتہاری کمپنی میں کام کرنے والے میری دوست زاہد بخاری نے یونی ہاتوں کے دوران مجھ سے کہا۔

”اوپار۔ ایسا یاد آیا تمہارے پاس ایک اداکارہ آئے گی زاری بیگم، پہلے وہ فون کرے گی اس کا بہت خیال رکھنا۔ وہ میرے کرم فرماؤں میں سے ہے۔ بہت جگہ میرے کام آئی ہے۔ نہ صرف اپنے میگزین کے لیے بلکہ اپنے اخبار کے شوہر پر پورے سے بھی ملوا دینا۔“

”حدود اور بوجہ کیا ہے اس کا؟“ میں نے ایک خاص اصلاح میں رازی بیگم کے بارے میں مزید معلومات چاہیں۔ تب اس نے پس منظر بتاتے ہوئے کہا۔

”باقی تم اس سے ملو گے تا تو وہ تمہیں اپنے بارے میں وہ سب بتا دے گی جو تم پوچھنا چاہو۔ تب سارا ہی حدود اور بوجہ معلوم ہو جائے گا۔ اس کی سب سے بڑی صلاحیت یہ ہے کہ تیرے جیسے خشک بندے کو بھی اپنا بنا لے گی، بہت ہنسنا اور کام آنے والی خاتون ہے۔“

”چلو آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ مگر مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے تم اس کے وکیل ہو۔“ میں نے جتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”یاد تم بھی سمجھ لو۔“ اس نے بھی جتے ہوئے کہا اور پھر ہم اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔

زاہد بخاری سے بات ہوئے تقریباً دو ہفتے ہوئے تھے۔ اپنی مصروفیت میں زاری بیگم کا نام بھی ذہن سے اتر گیا تھا۔ ایسے ہی ایک چمکتے ہوئے دن انٹرکام پر استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ موصوف وہاں آئی کھڑی ہے۔ میں نے اسے اندر اپنے کمرے میں بلوالیا۔ پہلی نگاہ میں وہ قطعاً ادیبہ و محکمہ لکھائی نہیں دیتی تھی۔ جوانی کا خمار اب بھی اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ اچھی صحت کی بدولت اس میں جوانی کے دور میں دکھائی دینے والی لڑکی جھلک رہی تھی۔ اس دور میں خواتین جو سنگھار کرتی تھیں، اپنا بیہوشانہ رنگ بھائی تھیں یا ملبوسات کی ایک خاص تراش ان دنوں میں مقبول تھی۔ وہ سارا عکس اس میں دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے سن اسی کی وہائی میں لکھے گئے کسی المانے کی ہیروئن حقیقی روپ میں سامنے آگئی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ اس کی عمر میں اضافہ ہوا تھا لیکن گاتا یوں تھا کہ جیسے وقت اس پر ٹھہر گیا ہو۔ وہ وقت جو اس کا اپنا پسندیدہ تھا، اور جس میں رہنا وہ پسند کرتی تھی۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ تھوڑی دیر ہاتوں کے بعد جب ہم کافی پی چکے تو میں نے پوچھا۔

”جی غرام ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”دیکھئے۔! اس وقت میں کسی بھی کام سے نہیں آئی۔ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے ملوں۔ آج ادھر سے گزر رہی تھی، سو چالٹی جاؤں۔“ اس نے کھٹکتی ہوئی آواز اور لوج دار لہجے میں کہا۔

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے بھی تکلفا کہا۔

”آج میں آپ کو خصوصی طور پر دعوت دینے آئی ہوں کہ جب بھی آپ کو فرصت ہو، میرے غریب خانے پر تشریف لائیں، وہیں پر کام کی باتیں بھی ہو جائیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے اس طرح بہت دن لگ جائیں اور مجھے فرصت نہ ہو، آپ پلیز بتائیں۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ زاہد بخاری میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں ہر ممکن حد تک۔۔۔“ میں نے کہا جاتا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتی ہوں کہ ایک پرسکون ماحول میں کام کی باتیں ہوں۔ اور پھر جس طرح بخاری صاحب آپ کے دوست ہیں۔ ہم بھی آپ کے دوست بن جائیں کیا خیال ہے؟“ اس نے ایک دوسرے انداز میں اپنی ہی بات منوانا چاہی۔ شاید وہ مجھے احساس دلارہی تھی کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔

”خیال تو بہت اچھا ہے۔ لیکن یہاں مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے۔ میں فقط شو بڑی نہیں دیکھتا بلکہ پورا میگزین۔۔۔“

”میں آپ کو فون کر کے یاد دلاتی رہوں گی۔ جب بھی آپ کو موقع ملے۔“ اس بار زاری بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے بھی وہیں بات ختم کر دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ ”یہ میرا فون نمبر ہے۔ آپ اس پر کال کر سکتے ہیں۔“ اس نے ایک کاغذ پر اپنا نمبر لکھتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اگلے ہفتے میں اس نے تین بار مجھے یاد دہانی کروائی تو پھر ایک دن میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت شام ہونے کو تھی جب میں اس کے گھر کے لیے اپنے آفس نے نکلا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اس علاقے میں پہنچ گیا جو کسی زمانے میں لاہور کا پوش علاقہ تصور کیا جاتا رہا تھا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وہاں بہت بڑے بڑے نام والی شخصیات یا پھر امیر آدمی وہاں پر رہائش پذیر تھے۔ میں جس گھر کے سامنے پہنچا وہ پرانے طرز کے بنکے جیسی عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد میں ایک بچے ہوئے ڈرائنگ روم میں تھا، جس کی سجاوٹ دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں سن اسی کی دہائی میں بننے والی اردو فلموں کے کسی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا زاری بیگم کے بارے میں یہ تاثر بن گیا کہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں ہی کہیں کھو گئی ہے۔ اس نے جدوجہد کونہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے گھر کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گپ شپ کے بعد زاری بیگم کے ساتھ تکلف کی فضا ختم ہو گئی اور اس کی جگہ خوشگوار ماحول نے لے لی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ چند ملاقاتوں کے بعد کام کی باتیں بھی ہونے لگیں بلکہ میں اس کے بارے میں بہت واضح ہو گیا۔

زاری بیگم نے سن اسی کی دہائی میں فقط شوق کے تحت اداکاری شروع کی تھی۔ اس کی والدہ، قیام پاکستان سے پہلے امرتسر کی مشہور طوائفوں میں سے ایک تھی۔ وہ اگست 47ء سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان کے شہر لاہور میں آ بسی تھی۔ امرتسر میں اس کا اچھا خاصہ رکھ رکھاؤ تھا۔ جو اس نے یہاں بھی آ کر برقرار رکھا۔ وہ اپنے ساتھ ساری جمع پونجی بھی لے آئی تھی اور وہاں کا محل نما مکان بیچ کر اس کے دام بھی کھرے کر لیے تھے۔ یہاں آ کر اس نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا اور اپنے ہی پرانے واقف کار وہ باری آدمی سے شادی کر لی۔ اس کی اولاد میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جن میں زاری بیگم سب سے آخری اولاد تھی جیسے بہت لاڈ پیار ملا۔ زاری بیگم نے اپنے گھر میں کاروباری گھرانے جیسا انداز بھی دیکھا تھا۔ تھمکر وٹیلے کی آواز کو تو جیسے وہ دفن کر چکے تھے۔ لیکن جب تک وہ جوان ہوئی، اس وقت تک فلموں اور ٹی وی ڈراموں کا ایک کریز بن چکا تھا۔ اس نے جوانی کی دلہیز پر قدم رکھا تو ساتھ میں اداکاری کا شوق بھی پروان چڑھ چکا تھا۔ اداکاری کی خواہش اس لیے بھی شدت اختیار کر گئی تھی کہ ان کے

لیے فی وی کوئی بہت دور کی شے نہیں تھی۔ بلکہ ذرا سی کوشش کے بعد اسے ایک سیریل مل گئی۔ جس میں اس نے جتنا ضد کر کے کام کیا اتنا ہی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ شہرت جہاں بہت تیز نشہ ہے وہاں بعض اوقات وہاں جاں بھی بن جاتی ہے۔ زاری بیگم کے منظر عام پر آتے ہی امرتسر والی طوائف کی شہرت بھی سامنے آنا شروع ہو گئی جو اتنے برس گزر جانے کے بعد حالات کی گرد میں چسپ گئی تھی اور کاروباری حلقے میں ان کی پہچان ایک نئے انداز میں ہو گئی تو کسی نے ماضی ٹٹولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ جب اس نے اداکاری شروع کی تو دہے بے لفظوں میں حالات کی گرد کے نیچے پڑی پہچان واضح ہونے لگی۔ اور پھر شہرت نے کسی چیز ہوا کی مانند ساری گرد اڑا دی۔ تب زاری بیگم کے بہن بھائیوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اسے دہاکر چار دیواری تک محدود کر دیا۔ شوہر تو کیا، اس سے متعلق کسی فرد کی رسائی زاری بیگم تک نہ ہوئی۔ یوں افواہوں کا بازار گرم ہوا تھا جو دھیرے دھیرے ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ زاری بیگم کی شادی لاہور ہی کے ایک کاروباری گھرانے میں ہو گئی اس کا شوہر افضل بٹ اسے بیاہ کر اسی گھر میں لے آیا۔ جہاں وہ ان دنوں رہ رہی تھی۔

افضل بٹ ماں لوگوں میں سے تھا جو فقط دولت بنانے کی جگہ دو دو میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دولت کس طرح اور کیسے آتی ہے، اس سے انہیں فرض نہیں ہوتی۔ اس نے ایک شاندار ہوٹل اور ایک شاہنگ پلازہ بنایا۔ جس سے وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے کاروبار کو بڑھانے کی جگہ دو دو میں لگ گیا۔ افضل بٹ طبعاً عیاش قسم کا بندہ تھا۔ اس کی سرگرمیاں زیادہ تر انہی لوگوں کے ساتھ تھیں، جو شوہر سے تعلق رکھتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ دھیرے دھیرے افضل بٹ کو اس دنیا سے بھی دولت کمانے کے ذرائع دکھائی دیے تو وہ پروڈیوسر بن گیا۔ اس شعبے میں آنے کے لیے بلاشبہ زاری بیگم نے بھی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی تھی۔ یوں اس کام میں دونوں کی خواہش شامل ہو گئی۔ افضل بٹ کا شوہر میں اچھا خاصہ حلقہ بن گیا تھا۔ جبکہ اپنی دلچسپی کے تحت زاری بیگم بھی اس کاروبار میں شریک ہو گئی۔ جو دن بدن بڑھتا چلا گیا۔

زاری بیگم کے من میں اداکاری کی خواہش راکھ میں دی ہوئی چنگاری کی طرح موجود رہی تھی۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ اداکاری کرے۔ لیکن ایک تو اپنی سطح کا لحاظ کرتے ہوئے اور دوسرا بہن بھائیوں کے خوف سے جس کا ماضی سے سامنا تھا۔ وہ اداکاری نہ کر سکی تھی۔ تاہم اپنے بزنس کو سپورٹ دینے والے لوگوں سے ملنا ملنا اور دوسرے اقدامات وہی کرتی رہی، جس میں صحافیوں سے اچھے تعلقات بھی شامل تھے تاکہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے بہت اچھا تاثر عوام تک پہنچ سکے۔ جو بلاشبہ مضبوط تعلق کی بناء پر ہو سکتا تھا۔ پھر ایک دن آیا کہ راکھ کی چنگاری کو ہوا مل گئی۔ اس نے اپنی ہی بڑے بجٹ کی ایک فی وی سیریل میں ایسا بھرپور کردار نبھایا کہ وہ فوراً ہی لوگوں کی نگاہ میں پہچان بنا گئی۔ نجانے کب سے تشنہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ زاری بیگم کو جو توقع سے زیادہ شہرت ملی تو وہ اپنے اس تاثر کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے اس میں اپنی شہرت کیش کرانے کی خواہش بھی تھی۔ سوانحی دنوں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ زاہد بخاری کے کہنے پر میں نے اس سے کافی کام لیئے۔ زاری بیگم نے بھی میری مدد کی۔ میری اس سے فطری دلچسپی تھی کہ مجھے ہر نئے سرورق سہانے کے لیے نئی ماڈل کی ضرورت ہوتی تھی۔ سو یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے رابطے میں ایسی کئی ماڈل گرل تھیں جو اداکاری کی خواہش میں ماڈلنگ کرتی تھیں۔ میری فونو گرافر چونکہ این سی اے سے تعلیم یافتہ تھی، اس لیے وہ بھی اپنے آپ میں مہمان شے تھی۔ اس کا بھی کام آسان ہو گیا۔ یوں ہمارے درمیان تعلق بڑھتا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ زاری بیگم کی کچھ بوجھ تھی کہ اس نے ہمیشہ

میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔ یعنی معمول کے اس برتاؤ سے بہت کر جو عام شوہر رپورٹر کے ساتھ تھا۔ اور پھر میں شوہر رپورٹرنگ کا بندہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کوئی فرض یا مطلب نہیں رکھا تھا۔ ہاں۔ ایک بات جو مجھے اچھی لگتی تھی وہ اس کا کنکٹنگ ٹا ہوا لوج وار لہجہ تھا بعض اوقات میں وہ سننے کے لیے طویل بات کر جایا کرتا تھا۔ اس سے جو بات بھی ہوتی، اس میں بہر حال خوشگواریت کا تاثر ضرور ہوتا تھا۔ اس دن جب میں نے اس کا کمر درالہجہ بنا تو مجھے قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اس بارے سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا فون آگیا۔

”آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔! میں ناراض نہیں ہوا۔ بلکہ مجھے یہ اچھا لگا کہ آپ نے کسی بہانے کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ مجھے صاف بتا دیا۔ ورنہ میں آپ سے امید رکھتے ہوئے کسی دوسرے ذریعہ سے رابطہ نہ کر پاتا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے مردانہ کہا۔ حالانکہ ایسا کہنے کو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ میں فوری طور پر اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔

”یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ایسا سوچا، لیکن اب میں نے وہ بیان دیا ہے تو مجھے لگا کہ میں آپ کو اپنا مسئلہ بتا دوں۔“ اس نے تذبذب سے کہا۔

”اب میں اس پر کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں کسی بھی رد عمل کا اظہار نہ کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

”آپ پلیز ایسا کیجئے کہ آج ہی، بلکہ ابھی وقت نکالیں اور میرے ہاں آجائیں۔ میں یہاں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔“ اس نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

”میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“ میں نے حتمی سے لہجے میں کہا تو وہ ذرا سے خوشگوار لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہی ہوں۔“ پھر چند باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

اس وقت شام کے سائے ڈھل جانے کے باعث شہر بھر میں برقی قہقہے روشن ہو چکے تھے۔ جب میں اس کے ہاں پہنچا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی۔ پھر سہولت سے بیٹھ جانے کے بعد بولی۔

”دراصل میں اس مسئلے میں تشہیر نہیں چاہتی، کیونکہ اس میں سراسر میرا اپنا ہی قصہ ان ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر کسی صحافی کے ہاتھ لگ گیا تو میں خواہ مخواہ حتمی قسم کی خبروں میں آ جاؤں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے سوچن، سوڈنٹن ہیں۔“

”آپ نے تو کبھی کسی سے نہیں بگاڑی؟ پھر آپ کے سوڈنٹن کیسے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ایسا ہو گیا ہے نا۔“ اس نے خود کھائی کے سے انداز میں کہا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ ”خیر۔! میں آپ کو بتاتی ہوں، لیکن پلیز یہ خبر کے لیے نہیں ہے بلکہ میں آپ سے مدد کی خواہاں ہوں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”چلیں، آپ بتائیں تو سہی۔“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ جو ابھی میری ٹی وی سیریل چلی ہے اس میں میرا کردار بہت بھرپور قسم کا تھا۔ رائٹر سے میں نے خود لکھوایا تھا۔ یہ آپ کو بھی معلوم

ہے اس سے مجھے ایک خاص قسم کا یوم ملا ہے۔ میرا شوق بھی پورا ہو گیا اور آئندہ مستقل اداکاری کا موقع بھی مجھے مل گیا ہے۔ بہت عرصے سے میرے دل میں ایسی خواہش تھی۔ میری اس خواہش کے بارے میں آپ کو بھی پتہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پہلو بدل کر بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "اب ہوا یوں کہ جہاں بت صاحب نے اپنی نئی سیریل کے لیے ایک کردار مجھے آفر کیا ہے بلکہ دو ڈائریکٹر تو مجھے سائن بھی کر چکے ہیں۔ اب وہ کیسا کردار لکھوائیں گے یہ مجھے نہیں معلوم، میرا ان سے بہر حال معاہدہ ہو گیا ہے۔"

"ایک منٹ۔" میں نے اس کی رد اس گفتگو کو روکا اور پوچھا۔ "کوئی سے کردار سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"مطلب وہ میری شخصیت کو دیکھ کر ہی کردار لکھوائیں گے، خبر یہ ایک فنی سی بات تھی، میں اصل بات بتاتی ہوں، اس نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ یعنی یہ ابھی تمہید ہی تھی۔" میں ان کی سیریل میں کام کروں گی یہ طے ہے، اور دوسرا ایک فلم کے لیے بھی میرے ساتھ بات چل رہی ہے۔ لیکن انجانے کون دشمن ہے، چند دنوں سے وہ مسلسل فون پر مجھے دھمکیاں دے رہا ہے کہ میں اداکاری بالکل نہ کروں، اگر کر کی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔" اس نے یوں کہا جیسے ایک بہت بڑی بات کا بوجھ اس کے سر پر سے ہٹ گیا ہو۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔

"کون ہے وہ۔ مطلب اس نے اپنا کوئی نام یا کوئی پہچان بتائی۔" میں نے تجوید کی سے پوچھا۔

"نہیں نا، ایسا ہی تو نہیں ہے۔ ورنہ میں اب تک اسے تلاش کر کے اس تک پہنچ نہ گئی ہوتی۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ اب یہ بھی معاف کر دینے والی بات نہیں ہے کہ کوئی ایسا غیر اٹھ کر مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دے۔" اس نے دبے دبے قصے میں کہا۔ تو میں چند لمحوں سوچتا رہا پھر پوچھا۔

"زاری بیگم! آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کوئی ایسا غیر اٹھ ہی ہے؟" میں نے کہا تو وہ چونک گئی۔ جب میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے کوئی ایسی وجہ بتائی کہ وہ کیوں آپ کو اداکاری نہ کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ کوئی شرط یا کوئی بلیک میلنگ یا پھر کوئی مطالبہ؟"

"میں نے پوچھا تھا اس سے کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہا ہے۔ جس پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کا یہی مطالبہ ہے کہ میں اداکاری نہ کروں۔ ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ اس کے علاوہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ اب یہ بات کہ مجھے اس کے امیرے غیرے ہونے کا احساس کیوں ہوا۔ تو ظاہر ہے میری شہرت سے کسی نے حسد محسوس کیا ہوگا اور اس نے کوئی غنڈہ بد معاش میرے پیچھے لگا دیا ہے کہ میں ڈر جاؤں اور اداکاری سے باز آ جاؤں۔"

"آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوئی بھی ہے، اور شو بیزنس کے حلقے میں سے ہے۔ بہت قریب ہی ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ میں نے معاہدے سائن کر چکی ہوں۔ اور مزید بات چیت کر رہی ہوں۔" وہ ایک تھکے سے بولی۔

"آپ کو علم ہے کہ پچھلے دنوں بازار حسن میں بھی ایک نوجوان اداکار کا قتل ہوا ہے۔ پھر بھی آپ یہ خیال کر رہی ہے کہ کوئی محض حاسد ہے جو آپ کو اداکاری سے روکنے کے لیے دھمکیوں پر اتر آیا ہے۔ میں نے اسے حالات کا ایک نیا پہلو دکھایا تو وہ چند لمحوں سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

نہیں، یہ وہ ہزار حسن والی بات نہیں ہے۔ وہ کوئی اور معاملات تھے۔ میرے معاملات میں تو یقیناً کوئی میری شہرت سے حسد کر علاوہ خائف بھی ہو گیا ہے۔ ورنہ پہلے کبھی کسی نے ایسی دھمکی نہیں دی، اور پھر یہ بات اس لیے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ صرف اداکاری سے روکنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" اس نے صاف انداز میں کہا۔

"آپ نے خود سے کوئی وجہ جاننے کی کوشش کی۔" میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے وجہ پوچھی، اس کا بس یہی ایک مطالبہ ہے کہ میں اداکاری نہ کروں۔ ضد ہو گئی ہو جیسے۔" زاری بیگم نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو میں نے ساری بات سیٹھ ہوئے پوچھا۔

"تو بتائے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"یہی کہ اس بندے کو تلاش کیا جائے، اس تلاش میں آپ میری مدد کریں۔" اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔
 "دیکھیں۔! میں کوئی فورسز کا بندہ تو ہوں نہیں۔ ایک معمولی صحافی ہوں۔ اپنے طور پر کوشش ہی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ میرے سے مسکرا دی اور پھر ذرا سے خوشنودار انداز میں بولی۔

"ارے نہیں۔ میں اس طرح سے تمہارا کہہ رہی ہوں۔ بلکہ میرا مطلب ہے کہ کہیں کوئی اشارہ آپ کو مل جائے۔ وہ جس طرح آپ کو اپنی خبروں کے لیے پل جاتی ہے ویسے میں نے ابھی بٹ صاحب سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ پہلے ہی بہت مشکل سے۔ خیر آپ سمجھتے ہیں۔ یہ بات دہرانے کا فائدہ ہی نہیں۔" اس نے کہتے کہتے بات ختم کر دی۔ پھر تھوڑی دیر تک اسی موضوع پر باتیں چلتی رہیں اس کے بعد میں اس کے پاس سے اٹھ آیا۔

زاری بیگم کا یہ مسئلہ کرئی نیا جہان کن نہیں تھا۔ شوبز کی دنیا میں ایسے معاملات چلتے ہی رہتے ہیں جیسے قلمی بیرونوں کے درمیان نمبروں کہلانے کی چپقلش اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے، چٹ پٹے، مصالحے دار بیانات سے قاری نہ صرف محفوظ ہوتے ہیں بلکہ ان کی اس جنگ میں بہت سارے پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ زاری بیگم نے جو باتیں کہیں ہیں وہ مٹی پر حقیقت ہوں مثلاً یہ کہ اس کے اپنے شوہر سے یہ بات چھپائی ہوئی ہے۔ ایسا ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنے گھر پر کڑی نگاہ تھی۔ میں نے جو سمجھا وہ یہی تھا کہ یہ ان کے بزنس کا معاملہ ہے۔ ان کے حریف کوئی نہ کوئی حربہ تو آزما رہے ہوں گے اور ان لوگوں سے بھی بعید نہیں تھا کہ انہوں نے کسی کے خلاف سازش کی ہو۔ اور رد عمل کے طور پر اسے دھمکیاں مل رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ لوگ ہی کسی کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہوں۔ اور پھر زاری بیگم کا یہ ڈرامائی انداز کی میں خبروں میں نہیں آتا چاہتی کہ کہیں شہرت کو نقصان نہ ہو۔ یہ الٹی گنگا بہنے والی بات تھی۔ حالانکہ شوبز کے لوگ تو خبروں میں رہنے کے لیے اسکیئنڈل تک خود ڈنڈا اٹھاتے ہیں۔ یوں مجموعی طور پر زاری بیگم کی پوری بات میرے حلق سے نہیں اتری میں نے اسے معمول کا واقعہ سمجھ کر ذہن میں تو رکھا لیکن اس کے لیے کوئی خاص جگہ دو نہیں کی۔

چند دن گزرنے کے بعد ایک صبح دفتر آتے ہی معمول کے مطابق اخبار پڑھے تو ان سب ہی میں زاری بیگم کی تصویر دیکھی۔ وہ کسی نئے ڈرامے کے اہتمام پر لپا گیا کرہ پ فوٹو تھا۔ اس تصویر میں زاری بیگم بہت خوشنودار موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں

سن اسی کی دہائی کے فٹشن کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑی منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس دن اتفاقاً ہمارے ہی اخبار کا شو بیز رپورٹر ساجد گوئندل بھی میٹنگ کے بعد میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس تصویر پر تبصرہ کرنے کے علاوہ افتتاح کی روداد سننے کی غرض سے ذکر پھیلے دیا۔ تب وہ بولا۔

”ہاں برات اچھا خاصا بنگا تھا۔ یہ تصویر تو بڑے پر امن ماحول میں بنی ہے۔ سمجھیں یہ سیریل تو بتانے سے پہلے ہی بک گیا ہے۔ بڑے بڑے لوگ تھے وہیں پر۔“

”یہ زاری بیگم کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس کی مانگ زیادہ ہوگئی ہے یا پئی آرا؟“ میں نے دھیرے سے پوچھا۔

”بہت تیز خاتون ہے۔ مجھے شو بیز کا ابھی اتنا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ لیکن جو بھی ہے۔ اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس جیسی تیز اور چرب زبان خاتون نہیں دیکھی۔ لکھوں میں بندے کو اپنی راہ پر لے آتی ہے۔“ وہ تو جیسے شروع ہو گیا۔

”میں اس کی خصوصیت نہیں پوچھ رہا میرے بار، میں اس کے پہلے سیریل کے بعد والی پوزیشن کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اس کی گفتگو کو ٹریک بدلنے کے لیے کہا تو اس نے سوچتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”ہاں۔! یوم تو ملا ہے اس کو۔ لیکن۔ اس کے ساتھ قتل کی دھمکیاں بھی تو مل رہی ہیں۔“

”ایسا کیا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ جو بات وہ چھپانا چاہتی ہے وہ کھلے راز کی مانند ہر کسی کو معلوم ہے۔ بلاشبہ یہ بات مخصوص حلقوں میں بھی گردش کر رہی ہوگی۔ میری حیرت کا ساجد گوئندل پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس لیے تفصیل بولا۔

”اس میں دو باتیں ہو سکتی ہیں، زاری بیگم اپنے آپ کو اہمیت دینا چاہتی ہے۔ لوگوں پر وہ یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ بہت بڑی فنکارہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دھمکیوں والی بات حقیقت ہے تو زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ دھمکی دینے والا سامنے آجائے گا۔ بلکہ پکڑا جائے گا۔ یہ زاری بیگم کے ہاتھ خاصے لیے ہیں۔“

”تمہاری پہلی بات سے میں اتفاق اس لیے نہیں کروں گا کہ اگر اس نے یہ بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ایسا کہا ہوتا تو اخبار کس مرض کی دوا ہیں۔ یوں سینہ بہ سینہ بات پھیلانے سے بہتر نہیں ہے کہ ہات ایک دن میں ہی سب کو معلوم ہو جائے۔“ میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ نہیں سمجھتے کہ سینہ بہ سینہ پھیلانے والی کتنی سنسنی ہے اور اس طرح لوگوں کو تبصروں سے بندہ سمجھ جاتا ہے کہ کون جتن ہے اور کون دشمن۔“ اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا جو بہر حال اپنا وزن رکھتی تھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ یہ محض انواہ ہے جو انہیں نے سنسنی کے لیے خود پھیلائی ہے۔؟“ میں نے گویا بات ختم کر دینا چاہی۔

”اگر ایسا نہیں تو پھر یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کیوں نہیں لیتے۔ ان کے گھر والے نمبر پر دھمکیاں ملتی ہیں تا۔ تو اس پر آئزرویشن لگوا دیں۔ پولیس یا پھر کسی دوسرے ادارے کا اپنا ایک تفتیشی طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہ شخص مل جائے گا اور دھمکیاں بند ہو جائیں گے۔ یونہی

خواہ مخواہ کا سنٹ کھڑا کیا ہوا ہے۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”خواہ مخواہ تو نہیں ہو سکتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیسی بات کرتے ہیں آپ، آپ کو سر درد آج ہے تو آپ علاج کسی اور وقت پر رکھ دیں گے یا پھر اسے نظر انداز کر دیں گے۔ جتنی تکلیف ہوتی ہے بندہ اتنی جلدی علاج کی کوشش کرتا ہے۔“ گوندل نے صاف لفظوں میں کہا اور پھر اس موضوع پر بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ چلا گیا اور میں اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا۔

اگلے دن کی شام ہونے سے تھوڑی دیر قبل زاری بیگم کا فون آ گیا۔ اس وقت میں دفتر سے نکلنے کے لیے پرتول رہا تھا۔ اس دن بھی زاری بیگم کا لہجہ کمر دراز تھا۔

”میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی ہے آپ آئے گا۔“

”ہمارے اخبار کے شو بک تو بلایا ہے نا آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں، ابھی گوندل صاحب سے بات ہوئی ہے، وہ آرہے ہیں۔ لیکن آپ تو ضرور آئیں نا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”موضوع کیا ہے پریس کانفرنس کا۔ مطلب کیا بات ہوگی؟“ میں نے پوچھی۔

”وہی ٹیلی فون والی دھمکیاں، آج تو ہمارے دفتر والے فون پر مجھے دھمکیاں ملی ہیں۔“ اس نے ذرا سی حیرت اور غصے طے جذبات میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اب آپ کل کر سامنے آ جانا چاہتی ہیں۔“ میں نے کریدنا چاہا تو وہ ایک دم سے غماط ہوتے ہوئے بولی۔

”اب یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ خیر! آپ آئی رہے ہیں، باقی باتیں یہیں ہو جائیں گے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ بلاشبہ اسے دوسرے

لوگوں کو بھی فون کرتا تھا۔ اس لیے میں نے فون رکھ دیا میں نے انہی لمحوں میں سراٹھا کر دیکھا تو سادہ گوندل کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ میرے متوجہ ہوتے ہی وہ بولو۔

”کیا خیال ہے۔ پھر چلیں؟“

”کہاں؟“ میں نے تصدیق کر لینا چاہی۔

”زاری بیگم کے گھر فون میں نے ہی آپ کی طرف ٹرانسفر کیا تھا۔“ گوندل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہم اس کے گھر کی جانب نکل گئے۔

وہاں پر شہر کے تقریباً تمام اہم شو بزرگ پورٹر پہنچے ہوئے تھے۔ ان سب کو دھمکیوں کے بارے میں معلوم تھا۔ اور وہاں پر اسی حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ ان کی قیاس آرائیاں تھیں کہ زاری بیگم آج کس حوالے سے بات کرے گی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے شوہر کے ساتھ باقاعدہ بات چیت شروع کی۔ لمبی چوڑی تمہید کے بعد اس نے یہی کہا کہ مجھے میرے حاسدین کی جانب سے قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں جو اب ناقابل برداشت حد تک جا پہنچی ہیں۔ سب سے اہم بات اس نے یہی کہ اب وہ باقاعدہ پولیس کے پاس جا رہی ہے۔ اس نے تھانے کا نام بتائے بغیر کہا کہ

ابتدائی رپورٹ لکھوادی گئی ہے۔ لہذا اب پولیس ہی کے ذریعے قانونی کارروائی کی جائے گی۔ سوال و جواب کا سلسلہ تھوڑی دیر تک رہا جو کہ سراسر تکلف ہی تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد صرف جواب دہمکیاں دینا ہے تاکہ وہ جو کوئی بھی ہے پولیس کے در سے خاموش ہو جائے۔ اس سارے دوران میں اس کا شوہر بالکل خاموش رہا تھا۔ اور پھر پولیس کا انٹرنس فٹم ہوتے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں اور گوندل بھی وہاں سے آگئے۔

میرے ذہن میں یہ بات چپک کر رہ گئی تھی کہ آخر یہ دہمکیوں والی بات اتنی لمبی کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا سلسلہ یا تو فٹم ہو جانا چاہئے تھا یا پھر اخبار میں تصویر آتے ہی اس کا کوئی نہ کوئی عملی ثبوت دیا جانا ضروری تھا۔ یا پھر کوئی قسط بھی چاہتا تھا کہ زاری بیگم اپنی پریشانی کا اظہار رہے۔ اتنے دنوں تک بات ایک ہی جگہ اڑی ہوئی تھی۔ شاید اس طرح کا خیال گوندل کے ذہن میں بھی تھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بولا۔

”کیا خیال ہے آپ کا، بیڈرامہ کچھ زیادہ لمبا نہیں ہو گیا؟“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اتنے دنوں بعد ان کی جانب سے بھی دہمکی دے دی گئی ہے۔ کیوں نہیں انہوں نے اب تک کوئی کوشش کی۔ پہلے یہ معاملے کی تفصیل نہیں چاہتے تھے اب باقاعدہ رپورٹرز کو بلوایا گیا ہے۔ پولیس کی بجائے خود ان کی اپنی رسائی بہت زیادہ ہے۔ کم از کم ٹیلی فون پر آؤ رویشن ہی لگوا لیتے۔ اس فون تک پہنچتے جہاں سے کال کی گئی ہے انہوں نے تو کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اگرچہ یہ بات دل کو گھٹتی ہے، تاہم انہوں نے ایسا ہی کیا ہو اور نمبر پولیس کو دے دیا ہو۔“ گوندل نے خیال آرائی کی۔

”تو پھر اتنی تشہیر کی ضرورت کیا ہے۔ چپ چاپ خاموشی سے اس بندے تک پہنچ جائیں اور بات ختم۔“ میں نے کہا تو گوندل نے ایک دم سے چپ کھٹے ہوئے کہا۔

”ذرا ایک منٹ۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب دیکھا۔ پھر کہتا ہی چلا گیا۔ ”اب تک سارے زاری بیگم کی ہمدردی میں ہیں۔ وہ رپورٹرز کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ کیوں تاہم اس خبر کو اپنے انداز میں دیکھیں۔ اپنی تحقیق کریں۔ نتیجہ جو بھی ہو اسے سامنے لے لیں۔ زاری بیگم اگر ناراض ہوتی ہے تو بھڑاؤ میں جائے۔“

”میرے خیال میں تم نے اب عقل مند کی بات کی ہے۔“ میں نے جیسے ہوئے کہا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ میرا نقطہ نگاہ کیا ہے۔ اس لیے تیزی سے بولا۔

”تو پھر کیوں تاہم کسی جگہ بیٹھ کر یہ طے کر لیں کہ آخر کرنا کیا ہے۔“ گوندل نے خالصتاً صحافیانہ انداز میں کہا تو میں ہنس دیا۔

”کل بات کریں گے۔ تم بھی اس پر سوچنا۔ میں بھی سوچوں گا۔“ میں نے کہا اور اپنی رادلی۔ اگلے دن وہ معمول کی میٹنگ کے بعد میرے پاس آ گیا اور آتے ہی یہی موضوع چھیڑ دیا کہ اس نے کیا سوچا ہے۔

”یقین جانیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ وہ مایوسانہ لہجے میں بولا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جس تھانے میں انہوں نے ایف آئی لکھوائی ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کیا۔ اور وہاں کوئی بندہ واقف ہے۔“

”مجھے معلوم ہے اور واقفیت ہے وہاں پر۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”پو پھر خبر لینے کے انداز میں اندر کی بات معلوم کرو۔ خصوصاً اگر زاری بیگم والے تفتیشی سے واقفیت نکل آئے تو۔ اس سے وہ نمبر معلوم کرنے کی کوشش کرو جس سے فون کیا جائے گا۔ کیا کیا گیا ہے۔ تمہی ہمارے لیے کوئی رسہ نکل پائے گا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”نمبر سے۔۔۔۔۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ ایک سٹبل جائے گی نایار۔! صرف نمبر چاہیے۔“ میں حتی انداز میں کہا۔

”تو یہ کون سی بات ہے۔ پولیس کو درمیان سے نکالیں۔ میں سیدھے ٹیلی فون والوں سے نمبر لے لوں گا۔ اپنا شہداد ہے وہاں پر۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ دم مکی دینے والا فون کرے تو۔۔۔۔۔“ وہ آخری فقرے میں بہت مایوسی سے بولا۔

”میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔ اگر دیا ہوا تو وہ فون بھی کرے گا۔ تب ہم نمبر کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”کیسا خیال۔؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”وہ میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے تم اپنا کام کرو اور یہ بھی یقین رکھنا کہ زاری بیگم کے حوالے سے ساری شوری تمہارے نام ہی سے ہو گی۔ فکر نہیں کرنا۔“ میں نے جیسے ہوئے کہا تو ایک دم خوش ہو گیا اور بولا۔

”میں آج ہی جاتا ہوں شام تک کوئی نہ کوئی بات تو بتا ہی دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چلا گیا۔ تو میں نے اپنی فون نوکر فون کر دیا۔ کچھ عرصہ قبل زاری بیگم نے اوجیز عمر خواتین کے سنگھار پر ایک ماڈلنگ کی تھی۔ اس کا اہتمام میری فون نوکر افری نے کیا تھا۔ اس میں اگرچہ زاری بیگم بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، تاہم میں نے اس کی وہ خاص ”لک“ کو برقرار رکھا تھا کہ وہ سن اسی کی دہائی والے فیشن ہی میں دکھائی دے۔ ساتھ میں جدید بھی تھی۔ لیکن دوسری ماڈلنگ اتنی پڑی ہوئی تھی کہ زاری بیگم کا نمبر نہیں آ رہا تھا۔ یوں اوجیز عمر ماڈل ہونے کی بناء پر نظر انداز ہو گئی تھی۔ میں نے وہ ماڈلنگ منگوائی۔ پھر ان میں سے تصاویر منتخب کر کے شائع ہونے کے عمل میں ڈال دیں اور خود اس پر ایک جھوٹا سا مضمون لکھ دیا۔ تین دن بعد میگزین نے منظر عام پر آنا تھا۔ اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ سامنے آنے والا تھا۔ اس دوران گوندل کے ذریعے بہت سارے معلومات ملتی رہیں۔ پولیس نے اپنا دستور پر شو بزد کے مکتوبوں میں پوچھا تاچہ کی، لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ انہیں خود اس بات پر حیرت تھی کہ دوبارہ فون ہی نہیں آیا۔ اب انتظار یہی تھا کہ دم مکی والا فون موصول ہو تو وہ اسے پکڑ سکیں۔ تفتیشی آفیسر نے خود گوندل میں دلچسپی لی تھی کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہو چکا تھا۔

تیسرے دن میگزین شائع ہو گیا۔ زاری بیگم کی تصاویر بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں تھیں، ساتھ میں مضمون کی سرخی جمائی تھی کہ میں اداکاری کے نئے پہلو حعارف کراؤں گی۔ حسب معمول گوندل میرے پاس آیا اس نے سرورق اور اندرون صفحات پر ماڈلنگ دیکھی اور پھر اس پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا۔

”ان باتوں کو چھوڑو، بلکہ جیسے بھی کہتا ہے کہو آج دم مکی آ میر فون آنے کا بہت قوی امکان ہے۔ اس موقع کو ضائع نہ کیا جائے۔“

”آپ کو کیسے یقین ہے؟“ اس نے فور سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس ہے تاہم فون کر کے کہہ دو بلکہ زاری بیگم سے بھی کہہ دو کہ وہ ہوشیار رہے اور زیادہ سے زیادہ بات کر کے اس بندے کا لہجہ، گفتگو کا انداز اور رائی کوئی خاص بات نوٹ کرنے کی کوشش کرے۔ پہلے کی طرح خضر یا ناراضگی کا اظہار نہ کرے۔ بلکہ اسے سمجھائے اور نہ سمجھے پروہمکی دے دے۔“ یہ اور اس طرح کی باتیں میں نے گونڈل کو سمجھائی اس نے میرے سامنے ہی دو تین فون کر دیے۔

”پھر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ مطرب سے ذرا پہلے، میں ابھی دفتر میں تھا کہ گونڈل کا مجھے فون ملا۔ وہ خاصا پر جوش تھا۔“

”آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا، زاری بیگم کو فون پروہمکی ملی ہے۔“

”یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ میں زاری بیگم کے پاس ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ لیس انٹی سے بات کریں۔“ پھر ذرا سی دیر میں دولٹاں پر تھی۔ اس کے کمر درے لہجے میں سے پریشانی جھلک رہی تھی اس نے مجھے وہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کینڈہ وہیں پولیس آفیسر بھی آ رہا تھا۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ سولت سے بیٹھنے تک پولیس آفیسر بھی آ گیا۔

”اس بار تو فون پر اس نے بڑی سنگین دھمکیاں دی ہیں کہ اب اگر اخبار میں تصویر تو کیا اداکاری کی بھی خیر شائع ہوئی تا تو وہ اب فون نہیں براہ راست قتل کرنے آ جائے گا۔ یہ آخری وارننگ ہے۔“ زاری بیگم نے بتایا۔

”آپ نے اس سے ایسی بات کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں کی تھی۔ مجھے تو وہ کوئی نوجوان سا جذباتی لڑکا لگتا ہے اس کا لہجہ اور زبان ٹھٹھکی ہوئی تھی۔ بہت غصے میں تھا یوں جیسے متواتر بات کر رہے ہو اس نے میری ایک نہیں سنی، بس اپنی سناٹے گیا تھا۔ پھر بند کر دیا۔“ وہ بولی۔

”تو اس کا نمبر معلوم ہوا؟“ میں نے عام سے انداز میں پولیس آفیسر سے پوچھا تو گونڈل فوراً بولا۔

”نمبر بھی معلوم ہو گیا ہے اور علاقہ بھی جہاں سے فون اہوا ہے۔ یہ نیو کیسپس کے پبلک ہوتھ کا نمبر ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے یہ کوئی طالب علم ہو سکتا ہے یا پھر کوئی بھی۔“ میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا۔

”ہاں۔! اب یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہوگا۔ اتنے زیادہ سٹوڈنٹس میں سے کسی بندے کو تلاش کرنا، پھر درمیان میں انتظامی امور کی بھی پیچیدگی ہوگی۔ اور پھر رد عمل کا بھی چانس ہے۔“ وہ دھیرے سے بولا تو زاری بیگم فوراً بولی۔

”یہ تو وقت طلب مرحلہ ہوگا۔ اس میں وہ اپنا کام دکھا سکتا ہے اگر وہ واقعتاً جذباتی ہے وہ یکسریں رسک تو ہے نا، جس طرح اس نے دھمکی دی ہے۔ میں شوہر والوں سے نہیں گھبراتی، لیکن اب تو یہ بہت پریشانی والی بات بن گئی ہے۔ مجھے تو اب واقعی پیچیدگی سے اوپر بات کرنا پڑے گی۔“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن آپ کی رپورٹ کے بعد کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”اب یہ تو میرے آفیسر ہی بتا سکتے ہیں نا۔“ اس نے بالکل ہی جان چھڑائی۔ اور پھر چند اداکاری باتوں کے بعد وہ چلا گیا۔ زاری بیگم اوپر

بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ سوہارا وہاں بیٹھنا فضول تھا، اس لیے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔

اس تھوڑی سی پیش رفت کے بعد یوں ہوا کہ جیسے مزید کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ زاری بیگم کو دوبارہ فون نہیں ملا اور نہ ہی کسی اخبار وغیرہ میں اس کی کوئی تصویر آئی۔ کیونکہ زاری بیگم اندر سے بالکل خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے شوہر کی سرگرمیوں میں حصہ لینا بند کر دیا تھا۔ تاہم اندر ہی اندر اس متوقع لڑکے کی تلاش جاری تھی۔ جو کہ خفیہ دالے کر رہے تھے۔ میں شاید اس بات کو بھول جاتا مگر گونڈل اپنی ہٹ کا پکا نکلا۔ وہ اپنی خبر کے منطقی انجام کے لیے سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی کبھار اس موضوع پر بات کر لی تو کر لی، ورنہ وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا معمول بنالیا ہوا تھا کہ دو سٹوڈیو جانے سے قبل انڈیکس پر ضرور جاتا۔ وہاں اس نے اپنے علاقے سے تعلق رکھنے والے طالب علموں سے دوستی کر لی۔ ان کے ساتھ مارکیٹ جاتا اور وہاں سے چائے ضرور پیتا۔ وہیں مارکیٹ کے پبلک بوتھ سے فون وغیرہ کرتا۔ اب اس کے معلومات لینے کا طریقہ کار کیا تھا، اس کا مجھے نہیں علم لیکن تقریباً ایک مہینے بعد اس نے بڑے ہی پر جوش انداز میں مجھے یہ خبر سنائی۔

”وہ زاری بیگم کو دھمکی دینے والا لڑکا، آپ کو یاد ہے نا۔“

”ہاں، یاد ہے، کیا ہوا؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔“ گونڈل نے اطمینان سے جوش بھرے لہجے میں دھیرے سے کہا۔

”کیا واقعی؟“ میں یہ سن کر گویا اچھل پڑا۔

”ہاں۔!“ یہ کہہ کر اس نے پوری روداد سنائی۔

اس کا وہاں جانا تو معمول بن ہی گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی کوشش سے دوسرے لڑکی بھی دوست بن گئے۔ چند شوہرین لڑکوں کو دو سٹوڈیو کی سیر بھی کر دلائی۔ کسی کے ساتھ قمیاضی وی میں کام دلانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ شوہر دنیا کی جھوٹی مچی پس پردہ کہانیاں بھی چلتی رہتیں۔ پھر ایک دن اسے معلوم ہوا کہ فیضان ملک نامی لڑکا ایک اداکارہ زاری بیگم سے شدید نفرت کرتا ہے۔ یوں اسے گوبر مقصود ہاتھ لگ گیا۔ ایک ہفتے کی کوشش کے بعد اس کا خشک یقین میں بدل گیا۔ بلاشبہ فیضان ملک ہی وہ لڑکا تھا۔ جس نے زاری بیگم کو دھمکیاں دیں۔

”مگر کیوں دیں اس نے دھمکیاں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ تو بالکل نہیں معلوم ہو سکا۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”میں نے بہت کوشش کی لیکن نہیں پتہ نہیں چلا، ہاں اسے شدید نفرت ہے۔“

”نفرت کی کوئی تو وجہ رہی ہوگی میری جان، اس طرح تو تمہاری رپورٹ بالکل جھکی رہ جائے گی۔“ میں نے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو چیلنج کر ڈالا۔

”اس لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ کیا کروں، اگر وہ لڑکا پکڑا گیا تو میں اپنے علاقے ہی میں نہیں، یہاں بھی طلبہ کی نفرت کا شکار ہو جاؤں گا۔ اور عین ممکن ہے مجھے نقصان بھی پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سارا کریڈٹ پولیس لے جائے گی اور اس لڑکے کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس پر تشدد بھی۔۔۔“ گونڈل یوں کہتا چلا گیا۔ جیسے سارے نتائج اس نے پہلے ہی سوچ رکھے ہوں۔ ایسا ہی کچھ میرے دماغ میں بھی چلتے لگا تھا۔

”تو پھر بھول جاؤ اس سارے معاملے کو، اپنی ایک رپورٹ کے لیے کسی کا مستقبل واؤپر مت لگاؤ۔“ میں نے انہوں سے کہا۔

”لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے“ اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”یو لو کیا؟“ میں نے بھی پوری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”جس قدر اس لڑکے میں ذہنی ہیکم کی خلاف نفرت ہے، اسی قدر ممکن ہے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی دھمکیوں پر عمل کر جائے۔ تب پھر کیا ہوگا؟“

”یہ بھی درست ہے تو پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کوئی اس کا حل سوچو، مجھے اس لڑکے فیضان ملک سے ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ذہنی ہیکم کو بھول کر اپنی پڑھائی کو ختم

کرے اور یہاں سے چلا جائے۔“ گوندل نے خاصا جذباتی ہوئے کہا۔

”لیکن کیسے میری جان۔ ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ اس کی نفرت کیوں ہے اس سے بات کریں گے تو نجائے اس کا رد عمل کیا ہو۔ خوف

زدہ ہو گیا تو بھی غلط ہے۔ چڑ گیا تو بھی ٹھیک نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس بات کو بھول جانا چاہیے۔“ میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں! آپ سے نہیں پر فیضان ملک سے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ شریف انٹنس قسم کا۔۔۔“

”پھر تو زیادہ خطرناک بات ہے۔ یہ جو شریف آدمی ہوتے ہیں نا، یہ اگر اپنی آئی پر آ جائیں نا تو اتنے دھماکے سے پھٹتے ہیں کہ ہر جانب

تباہی ہو جاتی ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”پھر بھی، کوئی بات، کوئی خیال۔۔۔ کوئی معاملہ، ویسے بھی خفیہ والے کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں، میں مانتا ہوں کہ وہاں ان کے اور

بہترے کام ہیں لیکن اگر فیضان ان کے ہتھے چڑھ گیا۔۔۔ تو کسی اور کیس میں پھنسا دیں گے۔“ گوندل نے نجائے کیا سوچ کر رکھا تھا۔

”یار، تم تو خوف زدہ ہی کرتے چلے جا رہے ہو۔ کوئی خوش گمانی والا پہلو سوچو، چلو خیر، کچھ سوچیں گے۔“ میں نے واقعتاً اپنی جان چھڑاتے

ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد گوندل چلا گیا لیکن میرے دل میں کھد بد شروع ہو گئی۔ گوندل کے دل میں اگر فیضان ملک کے لیے کوئی نرم گوشہ ہے تو کوئی نہ

کوئی بات ضرور ہوگی۔ ویسے اگر ہماری کوششوں سے دلوں زعمیوں کو لاحق خطرات کم ہو جائیں تو یہ کوشش کر لینی چاہیے۔ اور پھر! ایک سمانی کا

تجسس بھی تو اہمیت رکھتا ہے جو اپنے طور پر بہت بڑی دلیل ہے۔ میں اگر نہ بھی چاہتا تو میرا دماغ ادھر ہی گھومتا رہتا تھا۔

اگلے دن تک میرے دماغ میں ایک ہم کا خیال ابھی گیا۔ میں نے اس پر پوری توجہ سے سوچا تو وہ حریف گھر کروا دیا، یہاں تک کہ وہ

روشن ہو کر ایک منصوبے کی صورت اختیار کر گیا۔ تاہم اس میں جہاں کامیابی کے بہت زیادہ امکانات تھے، وہاں کسی بھی غیر متوقع رد عمل کی صورت

میں ناکامی بھی اتنی شدت سے ہوتی تھی میں نے گوندل کو بلایا اور اس سے بات کی۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔

”بس ٹھیک ہے۔ کامیابی، ناکامی ایک طرف، ہماری نیت ٹھیک ہے۔ اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔“ گوندل نے

پارے جذب سے کہا تو پھر ہم نے طے کر لیا۔ پھر دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے کہ ہمیں کب اور کیا کرنا ہے۔ یہاں تک کہ مطمئن ہو گئے۔

تیسرے دن کی شام میں ذہنی ہیکم نے ساتھ اس کی کار میں نکلا۔ ہماری منزل سنوڈ یو تھی۔ جہاں اس نے مجھے چند لوگوں

سے طوالتھا۔ اس کے پاس تھوڑی دیر کے لیے وقت تھا۔ کیونکہ ایک لمبے عرصے تک دھمکیاں نہ ملنے کے باعث اس نے ایک سیریل کی شوٹنگ میں حصے لینے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ پریس والوں سے دور رہے۔ سیریل مکمل ہو جانے تک اس حوالے سے کوئی تصویر یا خبر کہیں پر بھی شائع نہ ہو۔ ممکن ہے ان دنوں میں وہ دھمکیاں دینے والا اس کے سامنے آ جائے یا پکڑا جائے تاہم سیریل تو مکمل ہو ہی جائے گی۔ بھر دیکھا جائے گا۔ انہی باتوں کے دوران جب وہ میری مطلوبہ جگہ کی کالونی سے گزرنے لگی تو میں نے چند منٹ کا کہہ کر گاڑی اس جانب موڑنے کا کہا۔ اس نے گاڑی موڑ دی۔

”آپ جائیں اور جلدی سے آ جائیں۔“ زاری بیگم نے دیر سے کہا۔

”اچھا نہیں لگتا ہے آپ یوں سڑک پر کھڑی رہیں آپ بھی آ جائیں پلیز۔ وقت کا کوئی اندازہ تو نہیں ہوتا۔“ میں نے لہجائے سے کہا تو وہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی اور پھر میرے ساتھ اندر آنے کے لیے گیٹ کراس کر لیا۔

وہ میرے ایک بہت قریبی دوست کا گھر تھا جو ان دنوں خالی تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت گومدل کے ساتھ، فیضان ملک وہیں موجود تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے تو سامنے ہی صوفے پر گومدل کے ساتھ فیضان ملک ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اونچا لمبا قد، بھرپور جوان رہتا، چھوٹی چھوٹی سیاہ واڈھی والا بڑے ذیل ڈول کا تھا۔ زاری بیگم پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ یہی تازک ترین مرحلہ تھا۔ جس کے لیے گومدل پوری طرح تیار تھا۔ ممکن ہے وہ اسے وقتی طور پر تیار کر چکا ہو۔ اس لیے وہ نفرت اُبلتی لگا ہوں سے ہماری جانب دیکھتا رہا۔ جبکہ زاری بیگم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ سامنے بیٹھا ہوا وجہ لڑکا کون ہے۔

”گومدل صاحب آپ یہاں؟“ زاری بیگم نے چپکتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔! آئے ہیں۔ تشریف رکھیں۔“ گومدل نے کہا تو وہ بے نیازی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ میں بھی بڑے مختصراً انداز میں ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی غیر متوقع خطرے کے پیش نظر بندوبست کے بارے میں پوچھ لیا تو اس نے اثبات میں اشارہ دے دیا۔ تب میں نے زاری بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ کو میں یہاں اس لڑکے فیضان ملک سے ملوانے کے لیے لایا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے عام سے انداز میں پوچھا، پھر فیضان ملک کی جانب دیکھا جس کی لگا ہوں میں سے نفرت اُبل رہی تھی۔

”اس لیے کہ یہی وہ لڑکا ہے، جو آپ کو فون پر دھمکیاں دیتا رہا ہے۔“ میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ زاری بیگم ایک دم سے خوف کے ساتھ بلی ہو گئی۔ اس کی لگا ہوں میں وحشت پھیل گئی اور سارا مطلقہ کا فور ہو گیا۔

”کک۔۔۔ کک۔۔۔ کیوں۔۔۔ آپ کو ایسا نہیں۔۔۔ کرنا چاہئے۔ مجھے کچھ ہو گیا تو آپ اس کے ذمے دار ہوں گے۔۔۔ سب کو معلوم

ہے کہ میں آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔“ اس کی آواز میں نکت کے ساتھ لرزش بھی تھی۔ تب گومدل نے بیچیدگی سے کہا۔

”حوصلہ رکھیں زاری بیگم! یہاں آپ کو کسی قسم کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فیضان ملک بڑا سمجھ دار اور خاندانی آدمی ہے۔ یہ میرے ساتھ

وعدہ کر چکا ہے اور یہ وعدہ نبھائے گا نہیں۔ خیر۔! آپ دونوں کو اس طرح بغیر بتائے ملانا اگرچہ غیر اخلاقی عمل ہے اور ایک بڑا رسک بھی لیکن اس میں کوئی برائی بھی نہیں، بلکہ بھلائی ہے۔"

"کیا بھلائی ہو سکتی ہے جو دشمن قتل کی دھمکیاں۔۔۔" زاری بیگم نے تھوڑا حوصلہ بکڑتے ہوئے پوچھا تو میں نے بات کا نئے ہوئے کہا۔
 "یہی بات پوچھنے کے لیے کہ آخر فیضان ایسا کیوں کرتا رہا ہے اور آئندہ کبھی ایسا نہ کرے۔" یہ کہہ کر میں نے فیضان ملک کی جانب دیکھا اور پھر پوچھا۔ "کیوں فیضان، آپ ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں کہ فون پر دھمکیاں تک دے ڈالیں۔" میرے پوچھنے پر اس نے پہلے زاری بیگم کی طرف نفرت سے دیکھا اور پھر میری جانب دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

"مجھے اس عورت سے کوئی نفرت نہیں، لیکن اس کی اداکاری سے نفرت ہے۔ یہاں تک کہ مجھ سے بدداشت ہی نہیں ہوتا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں، گوئندل بھائی کو پتہ ہے۔ میرا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ قتل ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں، اب اگر اس کی کہیں کوئی تصویر دکھائی دی، تو میں واقعتاً اسے قتل کر دیتا۔" اس نے گھمبیر لہجے میں اپنا عا کہہ دیا۔

"دیکھیں فیضان۔! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو، اس کی وجہ جو بھی ہو۔ لیکن آپ کا مستقبل تو داؤ پر لگ جائے گا۔ ہم نے بہت سوچ کر اتنا بڑا رسک لیا ہے۔ اگر یہ اداکاری کرتی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے۔ دوسرے کئی اداکاری کر رہے ہیں۔" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 "گوئندل صاحب سے اس موضوع پر بڑی بات ہو چکی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ وجہ ضرور جانتا چاہیں گے لیکن۔! جو وجہ ہے وہ اتنی مقدس ہے کہ میں اس طوائف کے سامنے کہتے ہوئے بھی تو بین محسوس کرتا ہوں۔" اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے، آپ کی وجہ اتنی مضبوط ہو کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہو جائیں۔ یا یہ اداکاری چھوڑ دیں۔ میرے بھائی کوئی نتیجہ تو نکلا۔"
 میرے یوں کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اس نے آہستہ سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں حد درجہ بھٹکا ہوا گیا۔ زاری بیگم بھی تن گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ اس نے اسے کھولا پھر اس میں سے ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے اسے پکڑا تو اس نے کہا۔
 "دیکھیں۔! یہ تصویر دیکھیں۔"

میں نے اس تصویر کو دیکھا تو حیرت کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ زاری بیگم سے مشابہت ایک خاتون کی تصویر تھی۔ جس کے کانہ مے پر فیضان نے سر رکھا ہوا تھا۔ وہ کسی بڑی تصویر میں سے کافی گئی ہوئی تھی۔ تبھی میرے منہ سے نکلا۔۔۔ "یہ تو۔۔۔ زاری بیگم۔۔۔"

"نہیں۔۔۔! وہ جی اٹھا۔" نہیں۔ یہ اس کی نہیں ہے۔ یہ میری والدہ کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس کی شبہات اس عورت سے ملتی ہے۔ جب میں سے طوائف کے روپ میں دیکھتا ہوں تو مجھ سے بدداشت نہیں ہوتا۔ یہ منظر عام پر نہ آئے تو میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" فیضان نے یوں کہا جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت دکھ ہو رہا ہو۔ میں نے تصویر زاری بیگم کے سامنے کر دی تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے تصویر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے فیضان ملک کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔

”مجھ میں تم اپنی ماں دیکھتے ہو۔“ زاری بیگم نے یوں بڑپتے ہوئے کہا جسے اس پر حیرت نوت پڑی ہو۔

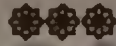
”ہاں۔! تم میں مجھے اپنی والدہ کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔ جو میرے لیے بہت مقدس ہے۔“ فیضان نے نرم لہجے میں کہا۔

”بیٹا۔! آج کے بعد تم مجھے کبھی اداکاری کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اس لیے نہیں کہ میں خوف زدہ ہوں بلکہ اس لیے کہ میری شبیہ

کسی ایسی ماں سے بھی ملتی ہے جسے کوئی بہت مقدس جانتا ہے۔“ یہ کہہ اس نے بھیک مانگنے والے انداز میں کہا۔ ”بیٹا۔! ایک بار فقط ایک بار تم مجھے اپنی ماں جیسی کہہ دو۔ پھر چاہے مجھے کوئی مار دیتا۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فیضان کی جانب دیکھا۔

”ہاں۔! یہ حقیقت ہے کہ تم میری ماں جیسی ہو۔“ وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولا تو زاری بیگم ہلکے ہلکے کر رو پڑی۔ وہ بہت دیر تک روتی

رہی یہاں تک کہ فیضان ملک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ کافی دیر بعد زاری بیگم کو ڈھارس ملی تو ہم بھی اٹھ گئے۔ اگلے دن زاری بیگم نے شو بیز کی دنیا سے لا تعلقی کا اعلان کر دیا۔



چاند، گنگن اور چاندنی

چاند، گنگن اور چاندنی آپ کی پسندیدہ مصنفہ اقرآء صغیر احمد کے حسان قلم کی تخلیق ہے۔ اس ناول میں مصنفہ

نے ہمارے معاشرے کی کئی فرسودہ روایات کے ہولناک انجام کی طرف توجہ دلائی ہے، جس میں ایک نہایت جہالت انگیز اور افسوسناک روایت بیٹی کی پیدائش کو باعث شرم سمجھنا اور انہیں بیٹوں کے مقابلے میں کمتر حقوق سمجھنا ہے۔ حالانکہ اسلام نے زمانہ جہالت کی اس روایت کا تہتی سے خاتمہ کیا لیکن ابھی تک ہمارے معاشرے میں یہ روایت نہ صرف موجود ہے بلکہ اس پر عمل کرنا لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دوسرا تباہ کن رواج نسل در نسل بدلہ لینے کی روایت ہے۔ ہمارے قبائلی اور پٹنوں کے کچھ علاقوں میں تو یہ روایت اتنی شدت سے پائی جاتی ہے کہ خاندان کے خاندان اس کی بھیبت چڑھ جاتے ہیں اور اس کا انجام محض تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس ناول کے دو کردار شبیہ خان اور شمشیر خان اسی روایتی مردانگی کے طہر دار ہیں جو عورتوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور ان پر ظلم و ستم کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ورشا آفریدی ایک بہادر لڑکی ہے جو اپنے خاندان کی اس روایت کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اور پھر اُسے کیسے کیسے جہنم زار سے گزرنا پڑتا ہے یہ جاننے کے لئے پڑھیے ”چاند گنگن اور چاندنی“۔ ہمیں امید ہے کہ اقرآء صغیر کے مداح اس ناول کو پسند کریں گے۔ ”چاند، گنگن اور چاندنی“ کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے ناول سیکشن کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہار

پہلی نگاہ میں دوری انگریز تھی۔ بوناقہ، گوری سینڈورٹی رحمت، سیاہ گھنیری پلکوں والی نیلی آنکھیں، گہری بھوری زلفوں میں کئی رنگوں کی ٹیس تھیں۔ جس میں سیاہ، بھورا اور بادامی رنگ نمایاں تھا۔ مختصر یالی زلفیں یوں دکھائی دے رہی تھیں کہ جیسے وہ شانہ سے نا آشنا ہوں اور ابھی ان میں سے پانی ٹپک پڑے گا۔ بھرے بھرے سرخ گال جیسے پورا چہرہ بنا دینے کے بعد کچھ زائد مٹی سے گال بنائے گئے ہوں۔ ستواں ناک، جس میں ہلکی سی سونے کی تاریخی۔ سرخ لب جس میں لکیریں واضح دکھائی دیتی تھیں۔ لمبی گردن میں نبھانے کتنی طرح کے الول جلوں بار پہنے ہوئے تھے۔ موتیوں کے، سونے کے، پتھر کے، لہجے اور چھوٹے ہار جو اس کے کھلے گریبان والی قمیض میں کچھ اندر تھے اور کچھ باہر۔ سیاہ پاکستانی لباس میں وہ حقیقت میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی لانی غروٹی انگلیوں میں مختلف طرز کی انگلیاں تھیں۔ ویسی ہی جیسے گلے میں موجود مختلف طرز کے ہار۔ وہ راحیلہ یاسر تھی۔ پاکستان نژاد برطانوی لڑکی جس کا تقریباً ایک ماہ پہلے فون مجھے ملا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کون تھی، کس مقصد کے لیے ملنا چاہتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا۔ اس نے یونہی بتایا تھا کہ وہ چند ہفتوں میں پاکستان آرہی ہے۔ یہاں آکر وہ مجھے کال کرے گی، پھر طے شدہ مقام پر ملیں گے۔ سو میں لاہور کے مہنگے ہوٹل میں اس کا مہمان بنا بیٹھا تھا۔ میں اس کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ کوئی بوڑھے یا پھر ادھیڑ عمر کے بزرگ نما انسان ہوں گے، اتنی تجربہ کاری تو وقت کے ساتھ آتی ہے نا۔ جب کوئی پختہ کار ہو جائے تو عمر کھپ جاتی ہے۔ مگر آپ تو اس کے برعکس نکلے۔ مجھے بہت اچھا لگا آپ کو دیکھ کر، جوان، پھر پور مرد اور بہترین شخصیت کے مالک۔۔۔“

”تعریف کرنے کا شکر۔۔۔“ میں نے دھمکے لہجے میں کہا اور دل ہی دل میں اس کی رواں اور شستہ اردو سن کر تعریف کی۔
 ”بلاشبہ آپ کے دل میں ہو گا کہ میں آپ سے کیوں ملنا چاہتی ہوں۔ مگر آپ اجازت دیں تو میں قہور اس کا پس منظر بیان کر دوں۔ مگر اس سے پہلے کیا میں ویٹر کو آرڈر نہ کر دوں؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔
 ”جی بالکل۔“ میں نے کہا اور اس نے ویٹر کو آرڈر کر دیا۔ پھر روئے سخن میری طرف کر کے بولی۔

”میرے بابا کا تعلق لاہور ہی سے ہے لیکن وہ برطانیہ ہی میں مقیم ہیں اور وہیں مرجن ڈاکٹر ہیں۔ ہم دہلی بہمن بھائی ہیں۔ وہیں پیدا ہوئے، پلے پڑھے اور جوان ہوئے۔ ہمارے بابا نے ہم سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا، سوائے اس کے ہم اردو بولیں، پڑھیں اور لکھیں۔ سو ہم دونوں بہمن بھائی اردو اہل زبان کی طرح بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم نے جہاں اور بہت کچھ پڑھا، وہاں ناو بھی بہت پڑھے۔ تقریباً دو برس قبل ہم دوستوں نے ایک پروڈکشن ہاؤس بنایا ہے جس میں فلم اور ٹی وی ڈرامے بنائے جائیں گے۔ ہم برصغیر کے اردو لکھاریوں سے کہانیاں

لے رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کہانی پر قلم بٹائیں اور کس پر نئی وی ڈراما اور کس ملک کے لیے۔ خیر۔! میں آپ کے سارے ناول پڑھ چکی ہوں۔ میں آپ سے کہانی خریدنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ اب آپ کے سامنے ہوں۔ اس نے مسکراتے ہوئے تمہید کے ساتھ ملاقات کا مقصد بھی بیان کر دیا۔

”آپ کیسی کہانیاں چاہ رہی ہیں۔“ میں آہستگی سے پوچھا۔

”ایسی منفرد کہانیاں جو ایک دم سے چونکا دیں۔ محبت بھری رومانی کہانیاں، جن میں نیا پن ہو۔ انسانی رویوں کے نئے پہلو جن میں بیان ہوں۔“ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

”دیکھیں یہ کسی بھی لکھاری کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے جو آپ کو نیا پن لگے، وہ نہ لکھاری کے لیے نیا ہو اور نہ ہی ناظرین کے لیے۔ اسی طرح لکھاری جیسے منفرد کہہ رہا ہو وہ آپ کے نزدیک منفرد نہ ہو۔ نیا انسانی رویہ آپ کے لیے کچھ اور میرے نزدیک کچھ دوسرا ہو سکتا ہے۔ عالمی سطح کی کوئی تحریر یکساں حیثیت نہیں رکھتی۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا جو اپنی روشن آنکھیں مجھ پر گاڑے ہوئے تھی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ حرکت میں آئی اور تیزی سے بولی۔

”لیکن پھر بھی کوئی چیز۔ جس میں انفرادیت ہو۔۔۔ میرے پاس اپنا ذاتی معیار ہے۔ جیسے میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اسی معیار کی کہانیوں کی تلاش میں ہوں۔ آپ، نامور اور کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ آپ کو شش کریں۔“ اس کے کہنے کا انداز یوں تھا کہ جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ اور میری صلاحیتوں کو آزمانے کے درپے ہو۔ اور پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس نے قلم دے کر چیز خریدنی ہے۔ وہ چیز کی پوری طرح جانچ پڑتال کر کے ہی خریدے گا۔ سو میں نے بھی اسے کھل کر جواب دینا زیادہ بہتر سمجھا۔

”یہاں پر دو باتیں ہیں۔ ایک کہانی سے متعلق اور دوسری آپ لوگوں کے رویے کے بارے میں۔“

”بولیں۔! بلکہ ضرور کہیں۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں تجسس سمیٹتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔ پھر میرے کہناں کا کردار جھک گئیں تاکہ میری بات کو بڑے غور سے سن سکے۔ ایسا کرنے سے اس کی گردن میں پڑے اول جھلک ہار ایک دم سے جھنجھٹا اٹھے۔ تبھی میری نگاہ ان باروں پر جا پڑی۔ یہ ایک اضرائی کیفیت تھی جس سے میری نگاہ تو پڑی لیکن وہاں کی جزئیات کو میں نے نہیں دیکھا۔ میرا ذہن اس کے جواب کے لیے لفظ ترتیب دے رہا تھا۔

”یہ جو ظلموں اور ڈراموں وغیرہ کی کہانیاں ہوتی ہیں نا۔۔۔ ان میں کمرشل پہلو زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام لوازمات جو قلم یا ڈارے کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ انہیں بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ جس ماحول کی کہانی کی آپ بات کر رہی ہیں۔ اس میں نیا پن، اسی ماحول ہی سے لیا جائے گا۔۔۔ مثلاً میرے پاس صحرائی علاقے کی روایتی کہانی میں نیا پن ڈالا جاسکتا ہے۔۔۔ ایسا ہی بہت کچھ ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ۔۔۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا جو ساکت و صامت انداز میں میری بات سن رہی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرے کہے ہوئے لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں۔ تبھی اس میں حرکت ہوئی اور اس نے دھیرے سے کہا۔

”جی، میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں۔ اس کا جواب میں بعد میں دیتی ہوں۔ آپ اپنی دوسری بات کر لیں۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ شوبز والے اسی طرح خیال جمع کر لیتے ہیں۔ اور پھر کسی نوآموز لکھاری سے اپنے مطلب کی ”شے“ لکھوا لیتے ہیں، بہت کم رقم میں۔۔۔ بعض اوقات نوآموز لکھاریوں کی تحریر کو اپنے نام سے استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک طرف سے سنے گئے خیال کو دوسری جانب استعمال کر لیا۔ آپ جانتی ہیں کہ یہاں ”خیال“ ہی کی قیمت ہوتی ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر اس پر واضح کر دیا کہ لکھاریوں کو لوٹنے کا چلن کیا ہے۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ آپ کی پہلی بات کو بعد میں زیر بحث لاتے ہیں۔ یہاں فی الحال میں واضح کر دوں کہ آپ اپنی کہانی سنائیں اور اس کا معاوضہ مجھے ملے کرنے کی اجازت دیں۔ میں ایک ہفتہ یہاں پر ہوں۔ آپ اپنے خیال سناتے جائیں اور ان کا فوری معاوضہ لیتے جائیں۔ جو کہانی میرے معیار پر پوری اتری، اس پر آپ اپنی مرضی کا معاوضہ مانگنے کے مجاز ہوں گے۔ یعنی کہانی لکھنے سے پہلے ہی آپ اس کی قیمت لے لیں۔ کیا کہتے ہیں آپ؟“ اس نے بڑی خوبصورتی سے بال میرے کورٹ میں پھینک دی۔ تب مجھے تذبذب میں کہتے ہوئے جی۔

”مجھے منظور ہے۔“

”گڈ۔! جہاں تک آپ کی پہلی بات ہے، اس کے ضمن میں عرض کروں کہ جو آپ کو اچھا لگتا ہے، جس ماحول کی جیسی بھی کہانی آپ کے ذہن میں ہے، مجھے سنائیں۔ جو اچھی لگی اس پر معاوضہ ملے کر لیں گے۔ ورنہ آپ کو اپنی کہانی کا معاوضہ تول ہی جائے گا۔“ اس نے سادہ سے انداز میں کہا تو میں مطمئن ہو گیا۔ اس دوران دیگر ہمارے درمیان کافی اور اس کے لوازمات رکھ گیا۔ کافی پینے کے دوران یہ طے پا گیا کہ وہ ایک دن میں کسی بھی وقت، کہیں بھی ملاقات طے ہو جایا کرے گی۔ وہیں کہانی سنا دی جائے گی اور وہیں معاوضہ دے دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کے پروڈکشن ہاؤس، برصغیر کے اردو لکھاریوں اور مختلف تحریروں پر بات ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

ہماری دوسری ملاقات ایک بنگلے میں ہوئی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھا یا بیٹھا کہ وہ چند لمحوں ہی میں وہاں آگئی۔ اس نے بلیک شارٹس اور سیلیو لیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی انگلیں کس کر باندھی ہوئیں تھیں، جس سے اس کا ہاتھ چڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بار گردن میں باروں کا بوجھ نہیں تھا بلکہ سفید موتیوں کا چھوٹا سا ہار تھا جو مونا پورلی خواتین پہنتی ہیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں نیلے رنگ کے پتھر والی ایک انگشتری تھی۔ پاؤں میں ایسے سلپہر لٹا جوتے تھے جیسے دو سیاہ خرگوش اس نے اپنے پیروں میں باندھے ہوئے ہوں۔ شارٹس اور سلپہروں کے درمیان سفید پنڈلیاں دکھائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک ٹکڑا اس کے چہرے پر ڈالی، جس پر شوق کے دیے روشن تھے۔ اس نے اوپر کی دانت سے نچلے ہونٹ کو دایا ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی ٹانگیں مجھ پر گاڑ دیں، جن میں تھمس پوری طرح میاں تھا۔

”جی، تو کیا آپ مجھے کہانی سنار ہے ہیں؟“ اس نے یوں پوچھا کہ جیسے شاید میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔

”بالکل۔ اکیا آپ سننے کے لیے تیار ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”جی، میں بے تاب ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر آنکھوں سمیت کھل کر مسکرا دی۔ تب میں اسے کہانی سنانے لگا۔ وہ ایک لڑکے کی کہانی تھی۔ جس طرح زیادہ محاسن کڑواہٹ کا باعث بن جاتی ہے، اسی طرح زیادہ محبت اس کے لیے اکتاہٹ بن گئی تھی۔ اسے ایک چہرہ دکھائی دینے

لگا، جو پھر بعد میں مجسم ہو کر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ ایک ہی ایک لڑکی، یعنی اس جیسا چہرہ رکھنے والی لڑکی کہیں دوسرے شہر میں بس رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لڑکا اس چہرے میں ڈوب جاتا ہے۔ جبکہ وہ لڑکی، اس لڑکی کی آس میں ہو جاتی ہے۔ وہ پورے انہماک سے میری کہانی سنتی رہی۔ درمیان میں اس نے مجھے قطعاً سڑب نہیں کیا۔ بلکہ پوری توجہ سے مجھے یوں سنتی رہی جیسے ایک ایک لفظ اپنے اندر اتار رہی ہو۔ اس دوران کھانے پینے کے لوازمات بھی چلتے رہے۔ یوں تقریباً ایک گھنٹے بعد میری کہانی مکمل ہوئی، جسے سننے کے بعد وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر قریب پڑا چٹاپر اس اٹھایا۔ اس میں سے بڑے پوٹوں کی ایک گندی کالی۔ اس میں سے کافی سارے نوٹ گئے، الگ کیئے، گنڈی واپس رکھی اور نوٹ اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر پیش کرنے والے انداز میں بولی۔ ”یہ آپ کی اس کہانی کا معاوضہ۔۔۔ کہانی اچھی تھی لیکن سوری، مجھے یہ کہانی اپنے معیار پر اترتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔“

اگرچہ وہ رقم میری اب تک کی کہانیوں کا سب سے زیادہ معاوضہ تھا، مگر وہ معاوضہ ہاتھوں میں آتے ہی مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے کسی ضرورت مند کی لفظ ضرورت پوری کی جائے۔ مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔ مراد تو کیا کہ یہ نوٹ اسے واپس کر دوں اور کہوں کہ جب میری کہانی پسند آئے تو میں اس کا معاوضہ اپنی مرضی سے لے لوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں ان خیالات کا اظہار کرتا۔ وہ اٹھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اجازت طلب کر رہی ہوں۔ میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا بلکہ باہر کی جانب لپکتا چلا گیا۔

ہماری تیسری ملاقات ایک فارم ہاؤس پر ہوئی۔ میں شہر کے ایک خاص مقام تک آیا، جہاں سے راحیلہ کی بھجوائی ہوئی گاڑی نے مجھے وہاں تک پہنچا دیا تھا۔ میں راستے میں سوچتا چلا آیا تھا کہ یہ راحیلہ اس کا خیر اگرچہ مشرقی ہی سے اٹھا ہے، والدین مشرقی ہیں مگر یہ تو ڈنٹی طور پر وہی انگریز ہے۔ اسی ماحول میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اس کے پسینے اڑھنے اور بات کرنے میں اسی ماحول کا اظہار ہے۔ اس کی سوچ بھی مغربی ہے۔ جبکہ کہانیوں میں مشرق پوری طرح ہسکتا ہے۔ ممکن ہے میری کہانی، اس کے معیار پر اس لیے نہ اترتی ہو۔ بہر حال میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی خواہش پر کہانیاں سناؤں گا۔ ایک تجربہ ہی سہی۔ گاڑی پورچ میں رکی تو ایک آیا نما ملازمہ اپنی معیت میں مجھے صحت تک لے گئی۔ جہاں فامبر کی کرسیوں میں ایک پر راحیلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلی جمبو پر سفید و سیاہ ڈھالا مین کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس میں سے اس کی گلابی بدن ہی پوری طرح عیاں نہیں ہو رہا تھا بلکہ اندرونی بھراہن کا سیاہ رنگ بھی پوری طرح واضح ہو کر اپنی ہلاکت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے اپنی زنجیں اکٹھی کر کے پونی میں باندھی ہوئیں تھیں۔ اس نے ہلکے سے سفید سلیر پہنے ہوئے تھے۔ جو اس نے ایک دوسری کرسی پر بیٹھ کر کئے ہوئے تھے اور مجھے دیکھتے ہی سمیٹ لیتے۔ اس نے زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں اس کی سامنے ولای کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر حال احوال کے تمہیدی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ماحول بہت شاندار تھا۔ چھت پر سے ارد گرد کے سبز منظر بہت خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے سامنے لوہا رنگہ گرد کے گنگش نگاروں کو دیکھ کر میں ویسے ہی سرشار ہو گیا۔

”جی تو پھر سنائے اپنی نئی کہانی۔۔۔“ اس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ تب میں نے چند لحاظ میں اپنے خیالات کو مجتمع کیا اور پھر کہانی سنانے لگا۔ یہ ایک لمبے پالک لڑکی کی کہانی تھی۔ جیسے اپنے والدین کا علم نہیں تھا۔ مگر جس کے پاس وہ رہ رہی تھی، اس کے رشتے دار اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ لڑکی اپنی ذات کے سراغ میں اپنے والدین کو تلاش کرنا چاہتی ہے اور یہی کمزوری ان کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ میں کہانی سنا رہا

اور اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی دیکھتا رہا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ جیسے کوئی منظر کو دیکھ رہا ہو، مگر اس پر سوچ نہ رہا ہو۔ کیونکہ میری ساری توجہ اپنی کہانی کے تار و پود، الفاظ کی لشت و برخواست اور جملوں کی بندش پر تھی۔ ہمیں کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ کوئی صحت پر نہیں آیا۔ میں کہانی سنا رہا اور راحیلہ پوری توجہ سے سنتی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب کہانی مکمل ہوئی تو اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کہانی بہت اچھی ہے، کسی بھی کمرشل فلم کے لیے استعمال کی جاسکتا ہے اسے۔ لیکن سوری سر! یہ کہانی میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔“

میرے جذبات پر اچانک ہی اوس پڑ گئی۔ اس کہانی کا خیال اگرچہ میرے ذہن میں بہت پہلے ہی سے تھا لیکن اس کا خلاصہ میں نے بہت محنت سے پوری رات لگا کر بتایا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا سفید لٹافے میں موجود پاؤنڈ لکال کر دیکھے اور پھر دو لٹافہ مجھے دے دیا۔

”مگن لیں۔ یہ پہلی کہانی سے زیادہ معاوضہ ہے۔“

نجانے کیوں مجھے یہ لٹافہ پکڑتے ہوئے خوشی نہیں بلکہ شرمندگی کے احساس نے جکڑ لیا۔ میں وہاں سے جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت کہا کہ میں لٹچ کے لیے رک جاؤں۔ مگر میں اندر سے مطمئن نہیں تھا اس وقت و طرح کے جذبات مجھ پر حاوی تھے۔ ایک کہانی کی تائید بیگ کی کا دکھ اور دوسرائی کہانی کی بدلت میں پوری قوت نکال دینے کا جذبہ، دو سوچ تک میرے ساتھ آئی۔ میں بہت اچھے انداز میں اس سے رخصت ہوا۔ وہاں سے نکلتے ہی نئی کہانی کی بدلت کے لیے خیالات کو اپنے قبضہ قدرت میں کرنے کی سعی کرنے لگا۔ ذرا عرصہ نے مجھے فارم باؤس سے شہر کے اسی مقام تک چھوڑ دیا، جہاں اسے میں نے کہا۔

ہماری چوتھی ملاقات مصنوعی جمیل والے پارک کے پرسکون گوشے میں ہوئی۔ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ کھنے درختوں کی چھاؤں میں دو کرسیاں تھیں اور درمیان میں میز دھرا ہوا تھا۔ راحیلہ کی بھیجی ہوئی گاڑی ہی مجھے وہاں تک لائی تھی۔ وہ ایک کرسی پر براجمان میری طرف پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس بار راحیلہ کی زنجیریں کھلی ہوئیں تھیں۔ جگمگے پیاز کی رنگ کا پاکستانی لباس پہنا ہوا تھا، جس پر گہرے میرون رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے۔ اس کا لباس خاصا تنگ تھا۔ جسم کے سارے خطوط مکمل کراپنا اکتھار کر رہے تھے۔ جگمگے میک اپ کے ساتھ، اس نے اپنے گلے میں سونے کی موٹی سی تین چین پھنی ہوئیں تھیں۔ ایک موٹی جو گلے کے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ درمیان میں اس کے سینے سے ذرا اوپر تک اور تیسری پٹلی جو سینے سے ذرا نیچے تک تنگ رہی تھی۔ لمبے لمبے سونے کے جھمکے اور حیروں میں سیاہ لیدر کے سلیپر کے ساتھ سونے کی پائل پھنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک لمبے کو سینے کی نیلی رگوں نے متوجہ کیا۔ تاہم میرا دھیان اپنی کہانی کی طرف تھا جو میں نے اسے سنانا تھی۔ میز پر کھانے پینے کے لوازمات پہلے ہی سجے ہوئے تھے، جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”لیں کچھ۔۔۔ ا۔“

”نہیں، بہت شکریہ۔ آپ کہانی سنیں۔“ باوجود کوشش کے میں اپنی بے تابی نہ چھپا سکا۔ سبھی وہ سیدھا ہوئی پوری طرح متوجہ ہو کر بولی۔

”جی، ضرور۔! سنائیں۔“

میں نے کہانی شروع کر دی۔ میرے تئیں وہ بہت منفرد کہانی تھی۔ اس میں عورت کے ان نازک جذبات کا بیان تھا۔ جو پیار کی پہلی ملاقاتوں میں اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور پھر کوئی انہی جذبات کو استعمال کر لیتا ہے۔ میں جتنے جذب سے وہ کہانی سناتا رہا۔ وہ اتنے ہی شوق و انہماک سے سنتی رہی۔ اس بار مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کہانی اس کے معیار پر پورا اترے گی۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کی نچوڑ کہانی اسے سنادی تھی۔ میری کہانی ختم ہوئی تو اس نے جذبے سے عاری چہرے کے ساتھ کافی دیر تک مجھے دیکھا۔ پھر بڑا کہہ اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا، بنا گئے ہی اس نے کافی سارے پاؤں اپنے ہاتھ میں لیے اور میری جانب بڑھا دیئے۔ میں نے پکڑ لیے تو وہ بولی۔

”مجھے افسوس ہے سر! آپ کی یہ کہانی بھی مجھے متاثر نہ کر سکی۔ میرے معیار پر نہیں اتری۔ بہر حال آپ کا معارضہ پیش ہے۔“

میں ایک دم سے چکر اگیا۔ دل چاہا کہ یہ معاوضہ اس کے منہ پر دے ماروں اور آئندہ کے لیے نہ ملنے کا کہہ کر اٹھ جاؤں۔ یہ میرے اندر کے ناپرسخت فحش کے جذبات تھے۔ لیکن ایک قلم مردور لکھاری کے لیے ایسا رویہ دکھانا، اس کے لیے ذہر قاتل ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ کیا میں مجر ہو گیا ہوں۔ میرے پاس حریف کوئی کہانی نہیں ہے؟ کیا میں اس بات کا اعتراف کر لوں کہ میں اس کے چیلنج کے سامنے ہار گیا ہوں۔ باوجود کوشش کے میں اپنے اندر کے جذبات کا اظہار نہ کر سکا۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے اجازت۔۔۔؟“

”دو دن بعد میں نے واپس چلے جانا ہے۔ اور ہماری فقط ایک ہی ملاقات ہو پائے گی۔ یعنی کل میں آپ کی آخری کہانی سنوں گی۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے انتہائی اختصار سے کہا۔

”اوکے!“

میں اس کار کی جانب بڑھ گیا جو مجھے یہاں تک لائی تھی اور اب مجھے اس نے واپس چھوڑ دیا تھا۔

اگلے دن میری پانچویں اور آخری ملاقات ایک معروف پروڈکشن ہاؤس کے آفس میں ہوئی۔ وہ چند لوگوں میں گھری ہوئی تھی اور ان سے کاروباری باتوں میں مصروف تھی۔ اس نے میرا کمرہ جوشی سے استقبال کیا، ہاتھ ملایا اور پھر مجھے ایک طرف صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ سیاہ کوٹ پہنوں اور سفید شرٹ کے ساتھ بالکل ایک کاروباری خاتون دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی باتوں کا انداز بھی سیدھا سادہ کاروباری تھا۔ جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی سارے معاہدے کر چکی ہے۔ کچھ کے ساتھ ابھی تذبذب میں ہے اور کسی کو صاف جواب دے چکی ہے۔ یہاں تک کہ ہم آفس میں تین لوگ رہ گئے۔ تیسرا شخص اس پروڈکشن فرم کا مالک تھا۔ راجیلہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بن کچھ کہے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ہم اب صرف دونوں تھے۔ وہ انہی اور میرے قریب صوفے پر آن بیٹھی۔ اتنے قریب کہ اس کے لباس پر لگی پریلیم کی جھبک نے ایک خاص خوشگوار تاثر دے دیا۔

”جی فرمائیں۔ اس ہمتن گوش ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر اپنے گلے میں ہنسی ہوئی سفید قیمتی موتیوں کی مالا کو اٹھل

سے سہلایا۔

”کیا آپ معروف ہیں؟“ میں اضرائی کیفیت میں پوچھا تو دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ نہیں تو۔۔۔ میں صرف اور صرف آپ کے لیے یہاں ہوں آپ جب تک یہاں اس کمرے میں ہیں، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ سوائے آفس بوائے کے۔۔۔ وہ کچھ کھانے پینے کو تولائے گا۔۔۔“

”تو پھر سناؤں کہانی۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”جی۔“ اس نے کہا اور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس بار جو میں نے اسے کہانی سنائی، وہ ان حالات کے بارے میں تھی جو کسی بھی انسان کی شخصیت بنانے یا بگاڑ دیتے ہیں۔ اور اس میں انفرادیت یہ تھی کہ ان حالات میں وہ کون سے گھناؤنے یا پاکیزہ لمحات ہوتے ہیں۔ جن کے تاثرات بہت دور تک جاتے ہیں۔ کہانی فیصلوں کے دور رس اثرات پر مبنی کہانی میں روایتی کردار تھے جو ہماری تمام زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ وہی تقریباً ایک گھنٹہ تھا۔ درمیان میں دوبار کافی کے ساتھ لوازمات بھی آئے۔ میں کہانی سنا چکا تو اس نے اپنے پرس کو سیدھا کیا اور پاؤں دھو کر اچھی خاصی تھوڑا لٹکالتے ہوئے بولی۔

”سوری سر جی۔ اس بار بھی آپ کی کہانی معیار کو نہیں چھو سکی۔“

میں اس کے یوں کہنے پر ایک دم سے ہلکا ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر فقط مجھے زچ کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ شاید وہ اپنے کسی جذبے کی تسکین کی خاطر اس طرح کا رویہ اپناتے ہوئے تھی۔ یا پھر گھٹیا لوگوں کی طرح ذہنی اذیت دے کر اندر کے تخلیقی انسان پر کاری ضرب لگانے کی ذلیل کوشش تھی۔ تاکہ تخلیقی انسان اپنے زخموں کو سہلانا ہو اور ذہنی اذیت کا شکار ہو جائے۔ جس سے وہ احساس کمتری اور اپنے ہاتھ پتہ کے ہاتھوں لٹل ہو جائے۔ تبھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے اب تک دیئے ہوئے سارے پونڈ نکالے اور اس کے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔ یہ اپنی رقم اپنے پاس رکھیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔۔۔ سر۔۔۔ یہ آپ کے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مزید رقم ان پر رکھ کر مجھے دینا چاہے مگر میں نے نہیں لیے۔ وہیں پڑے رہنے دیئے تو وہ بولی۔ ”یہ آپ کا معاوضہ ہے۔ آپ کا خیال میں نے سنا تو۔۔۔“

”نہیں۔! آپ اس کے عوض فقط ایک بات بتادیں۔“ میں دھیمے لہجے میں کہا

”پوچھیں۔!“ وہ اشتیاق سے بولی۔

”آپ کا معیار کیا ہے، ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”ہاں۔! میں آپ کو ایک چھوٹی سے کہانی سناتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”جی ہاں! میں جلد تن گوش ہوں۔“ میں نے بھی اسی کے لفظ استعمال کیئے۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ تب اس نے پوچھا۔

”کیا آپ عورت کی اس ملاحیت سے واقف ہیں کہ وہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت دیکھ لیتی ہے۔“

”جی، مجھے معلوم ہے۔“ میں نے دھیمے سے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”تو بس پھر اسی کو ذہن میں رکھے گا۔ اب میں آپ کو کہانی سناتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ پھر کھٹی چلی گئی۔ ”میں نے بہت بڑھ چاہا۔ بے تحاشا اردو لکشن پڑھا۔ مجھے پڑھنے میں یہاں تک مہارت ہو گئی کہ لکھنے والے کی شخصیت مجھ پر واضح ہو جاتی تھی۔ میرے اپنے ذہن میں برعورت کی طرح ایک رومانوی شخص کا ہیولا ہے۔ جو مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ وہ اتنا رومانوی ہے کہ میں اس کی محبت کی پھوار میں اس قدر بھیگ جاتی ہوں کہ بے بس ہو جاتی ہوں۔ وہ شخص میں نے آپ کی کہانیوں میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں اپنے رومانوی شخص تک پہنچ گئی ہوں۔ میں نے اس کا زندہ وجود پایا ہے۔ یہاں تک کہ میں آپ سے ملی۔ یہ سچ ہے کہ میں ایک پروڈکشن ہاؤس کی مالک ہوں۔ مجھے اچھی کہانیوں کی تلاش ہے۔ آپ کی یہ ساری کہانیاں اچھی ہیں اور میں ان کا معاہدہ آپ سے ابھی کروں گی لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”آپ کی کہانیوں میں جس قدر رومانس ہے، جذبات نگاری میں انوکھا پن ہے، ہر اپنا نگاری میں کمال ہے، محبت کے احساس کی اتھاہ گہرائیاں ہیں، خوبصورت ترین اور بے خود کردینے والے جذبات کی کارفرمایاں پوری لطافت کے ساتھ آپ کی تحریروں میں ہے۔۔۔ معاف سمجھئے گا۔۔۔ وہ آپ میں نہیں ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گلے میں پڑے نئے موتیوں کے ہار کو پھر لاشعوری طور پر انگلیوں سے چھوا۔

”آپ کو اس سے کیا، آپ کو کہانی چاہیے تھی۔ مصنف کی شخصیت جیسی بھی ہو۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں آپ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ میں نے آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعے بہت چاہا تھا۔ ان دنوں کہانی سننے کے دوران میں نے آپ کا ہر لمحہ جائزہ لیا۔ عورت کی نگاہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت تک پڑھ لیتی ہے۔ سو آپ بہترین رومانوی لکھاری ہیں۔ مگر رومانوی انسان نہیں۔۔۔“ اس نے بے چینی میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر میز کے عقب میں پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں میرے لیے اجنبی ہو گئیں تھیں۔ میں اٹھا اور آفس سے باہر نکلا چلا گیا۔ اس کے اعتراف نے میرے اندر کے تخلیقی انسان کو بچا لیا تھا۔ جس پر میں خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ تاہم میرے اندر ایک سوچ بڑی شدت سے سوال بن گئی تھی کہ میں ہار گیا ہوں یا وہ ہار گئی ہے؟



(ختم شد)